بسم الله الرحمن الرحیم

شعور اتحاد

سال دوم ۞ شمارہ (۶) ۞ محرم الحرام، صفر، ربیع الاول ۱۴۳۰ھ ۞ جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۹ء

پیشکش: مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی

نگران اعلیٰ: آیۃ اللہ محمد علی تسخیری

مدیر مسؤل: علی اصغر اوحدی

علمی گروہ کی زیر نگرانی

چیف ایڈیٹر: سید احتشام عباس زیدی

سہ ماہی ''شعور اتحاد'' مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو مستحکم بنانے نیز عالم اسلام کو فقہی، حقوقی، کلامی، فلسفی، تاریخی و... میدانوں میں درپیش مشکلات اور دشواریوں کے حل کے لئے نئی راہیں کھولتا ہے۔

یہ مجلّہ مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے متعلق لکھے جانے والے علمی مقالوں کا استقبال کرتا ہے۔

یہ مجلّہ مقالات کی ایڈیٹنگ اور تلخیص میں آزاد ہوگا۔

مجلّہ کے مطالب نقل کئے جاسکتے ہیں لیکن حوالہ ضروری ہے۔

.....

ایڈریس: تہران، خیابان آیۃ اللہ طالقانی، شمارہ ۳۵۷ ''مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی''

معاونت فرہنگی و پژوہشی

ٹیلی فون: ۱۳۔۸۸۳۲۱۴۱۱۔۸۸۸۲۲۵۳۲۔ای میل andisheh@taqhrib.org

فہرست

عزت اور ذلت ..... اداریہ ۵

فکر و شعور

اسلامی حکومت کے نظریاتی اصول ..... آیۃ اللہ محمد مہدی آصفی ۱۱

فتنوں کو سرکوب کرنے میں نبیؐ کا طرز عمل ..... اسعد السمرانی ۳۷

اسلامی اتحاد امام خمینیؒ اور آیۃ اللہ خامنہ ای کی نظر میں ۵۱

عزاداری اور تحفظ شریعت ..... سید احتشام عباس زیدی ۸۳

اخلاقی اقدار کا دینی تعلیمات سے رابطہ ..... ڈاکٹر شیخ محمد حسنین ۹۱

مذہبی رواداری ..... محمد علی خالدیان ۱۱۳

نہج البلاغہ میں شیعہ سنی اتحاد ..... سعید خو محمدی خیرآبادی ۱۳۵

اتحاد کے علمبردار

علامہ حلی یوسف بن مطہر (آفتاب حلہ) ..... رحیم ابوالحسنی ۱۶۵

شیخ محمد مصطفےٰ مراغی، الازہر کے جوان سال مفتی ..... عزالدین رضانژاد ۱۸۳

عالم اسلام کا تعارف

ٹونس ..... ع۔ر۔امیر دہی ۱۹۱

اداریہ

عزت اور ذلّت

اسلام کی تاریخ اگرچہ عزت اور سربلندی کی تاریخ ہے لیکن حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ اور درخشاں راہ سے جب بھی ہٹی ہے اس میں ظلم وستم، قتل وغارت، درندگی اور بہیمیت کے ایسے دل ہلا دینے والے مناظر نظر آتے ہیں جن کی مثال دوسری انسانی تاریخوں میں کم ملتی ہے۔ درحقیقت اسلام کی تاریخ کے دو نمایاں اور بالکل مختلف پہلو ہیں۔ ایک روشن اور تابناک اور دوسرا تاریک۔ ایک شرافتوں کا حامل تو دوسرا ذلتوں کا نمونہ۔ ایک میں انسان اپنے نقطہ کمال پر نظر آتا ہے تو دوسرے میں حیوانوں سے بھی پست دکھائی دیتا ہے۔ ایک میں وہ خلافت الٰہی کا نمائندہ نظر آتا ہے تو دوسری طرف شیطان کا چہرہ بھی سفید کرتا نظر آتا ہے۔ درحقیقت دونوں میدانوں میں اس کی انتہا اور منزل آخر کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں صورتیں جس فیصلہ کن معرکہ میں بیک وقت نظر آئیں وہ معرکہ کربلا ہے۔

اصل میں انسان اپنی عزت وشرافت سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ عزت خمیر انسانیت ہے۔ اگر عزت نہ ہو تو اہل عزت کی نظر میں زندگی موت سے بدتر ہے۔ ذلت کے ساتھ جینا مُردوں کی طرح جینا ہے، غلاموں کی طرح زندگی بسر کرنا ہے۔ اور جو اپنے آپ کو پہچانتے ہیں اپنی انسانیت کا پاس رکھتے ہیں وہ ذلت آمیز زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ صفین کے معرکہ میں جب لشکر شام نے لشکر کوفہ پر پانی بند کر دیا اور حالات بگڑنے لگے تو امیر المومنین علیؑ نے ایک پرجوش خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ اگر تمھیں پانی چاہیے تو پہلے اپنی شمشیروں کو سیراب کرنا ہوگا تب خود سیراب ہو سکتے ہو ورنہ ذلت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اسی خطبہ میں عزت اور ذلت کے مفہوم کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں ''**فالموت فی حیاتکم مقھورین والحیات فی موتکم قاھرین**'' (نہج البلاغہ)[1]

.....

۱۔ نہج البلاغہ، صبحی صالحی، ص/۸۸ خ/۳۹

تمھاری زندگی میں موت یہ ہے کہ ذلیل بن کر رہو اور تمھاری موت میں زندگی یہ ہے کہ باعزت وسر بلند رہو۔قرآن کریم نے مسلمانوں کو ہمیشہ باعزت زندگی بسر کرنے کی تاکید کی ہے۔قرآن کی نظر میں عزت وسر بلندی درحقیقت ایک مسلمان کی پہچان اور اس کے ایمان کی علامت ہے۔درحقیقت قرآن نے عزت کو اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنوں سے ہی مخصوص قرار دیا ہے۔'' **و للّٰہ العزۃ و لرسولہ و للمومنین**''(منافقون/۸)۔

سیدالشہدا امام حسین علیہ السلام سے جس وقت پہلی بار مدینہ میں بیعت کا سوال کیا گیا تو آپؑ نے اپنے شرف اور یزید کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا '' **انا اھل بیت النبوۃ و معدن الرسالۃ و مختلف الملائکۃ مھبت الوحی بنا فتح اللہ و بنا یختم و یزید فاسق فاجر شارب الخمر قاتل نفس المحترمہ المعلن بالفسق و مثلی لا یبایع مثلہ**''[1] ہم اہل بیت نبوت ہیں ہم رسالت کی کانیں ہیں ملائکہ کی رفت وآمد کی جگہیں ہیں وحی کے نازل ہونے کی منزل ہیں اللہ نے ہم ہی سے کائنات کا آغاز کیا ہے اور ہم ہی پر اسے تمام کرنے والا ہے۔اور یزید فاسق وفاجر، شراب پینے والا، بے گناہوں کا خون بہانے والا، اور کھلم کھلا برائیاں کرنے والا ہے۔اور میرے جیسے لوگ یزید جیسوں کی بیعت نہیں کر سکتے۔یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ امام حسینؑ نے تنہا یزید سے اپنی بیعت کا ہی انکار نہیں کیا ہے بلکہ یہاں عالم انسانیت میں عزت وشرف کی زندگی بسر کرنے والے ہر زمانے کے انسانوں کی ترجمانی بھی کی ہے کہ نہ صرف میں ایسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا بلکہ میرے جیسے تمام انسان یزید جیسے افراد کی بیعت نہیں کر سکتے۔امام حسینؑ روز عاشورا جنگ کے آغاز سے پہلے اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''**ان الدعی و ابن الدعی قد رکزنی بین اثنتین بین السلۃ و الذلۃ و ھیھات منا الذلۃ**''[2] اس ظالم وغدار کے بیٹے ظالم وغدار نے مجھے دو چیزوں کے درمیان کھڑا کر دیا ہے، یعنی تلوار کی باڑ اور ذلت کی زندگی کے درمیان اور مجھ سے بعید ہے کے میں ذلت کی زندگی اختیار کروں۔یعنی میں ذلت کے ساتھ جی ہی نہیں سکتا۔آج دنیا کے تمام آزادی پسند اور غیرت مند انسانوں کا نعرہ یہی حسینی نعرہ ہے '' **ھیھات منا الذلۃ**''

فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امام حسین علیہ السلام نے عزت وشرف اور دین کی حفاظت میں بے مثال قربانیاں پیش کیں، اپنے اہل بیت کی بظاہر رسوا کن اسیری برداشت کی لیکن اس عزت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا

۱۔فرہنگ جامع سخنان امام حسینؑ، گروہ حدیث، ص/۳۲۰

۲۱۔فرہنگ جامع سخنان امام حسینؑ، گروہ حدیث، ص/۴۷۸

جس کا سلسلہ حسین علیہ السلام سے خدا تک پہنچتا ہے۔عزت اور سر بلندی کی یہ آواز حسینؑ مظلوم کے کٹے ہوئے سر سے زمان و مکان کی تمام حدوں سے گزرتی ہوئی کائنات کے گوشہ گوشہ میں اور دنیا کے تمام آزادی پسندوں کے کانوں سے ان کے دلوں کی گہرائیوں تک اتر گئی۔اور جنہوں نے اس عزت وسر بلندی کی راہ میں اپنے عہد کے استکبار سے ڈرتے ہوئے قدم پیچھے ہٹائے ،سبط رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ نہ دیا بلکہ کسی نہ کسی صورت ظالم و جابر کی حمایت کی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذلیل و رسوا ہو گئے اور دنیا کے تمام آزادی پسند اور غیرت مند انسان شہادت امام حسینؑ کے بعد مکتب حسین علیہ السلام سے وابستہ ،اسی خونی راہ پر چل کر عزت وسر بلندی سے ہمکنار ہوتے رہے اوراس دو روزہ زندگی کے اسیر اپنے منافع کی بربادی کے تصور سے خوف زدہ ہوکر ہر عہد کے ظالم کے آگے گھٹنے ٹیکتے ،اور ذلت آمیز زندگی بسر کرتے رہے۔یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔آج بھی انہی نگاہوں سے عصر حاضر کے عزیزوں اور ذلیلوں کو صاف طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔

کربلا آج بھی اپنی تمام عظمتوں ،شوکتوں ،اور جلالتوں کے ساتھ انسانی قوموں اور نسلوں میں آزادی اور سر بلندی کی روح پھونک رہی ہے۔دشمن کے ہاتھوں میں وہی پرانے حربے ہیں اور وہی شیطانی ذہنیتیں۔زمان و مکان کے بدلنے سے اس کی شیطانی ذہنیت میں فرق نہیں آتا ہے۔آج چودہ سو برس کے بعد بھی کربلا کی ایک تصویر غزہ میں نظر آرہی ہے۔(اگر چہ کربلا ،کربلا ہی ہے اور حسینؑ ،حسینؑ ہیں۔) آج بھی ظلم ،عزت پسند مسلمانوں سے بھوک پیاس ،محاصرہ ،فوجی یلغار ،بہیمانہ قتل عام ،گھروں کی تاراجی اور بستیوں کی بربادی کا امتحان لے رہا ہے۔مظالم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں اور صیہونی درندے اپنے میڈیا کے سہارے ایک طرف مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں اور دوسری طرف مظلوم فلسطینیوں کا بے دھڑک خون بہا رہے ہیں۔اور ماں باپ کی گودیوں میں ان کے بچوں کو قتل کرنے میں لذّت محسوس کرتے ہیں۔۱۸ مہینوں سے اقتصادی اور غذائی ناکہ بندی کے بعد اچانک زمین، ہوا، اور دریا سے زبردست فوجی یلغار کے ذریعہ بے گناہ فلسطینی بچّوں ، بوڑھوں ،مردوں اور عورتوں کا دردناک قتل عام جو محرّم الحرام کی پہلی تاریخ سے جاری ہے ،اس نے دنیا کے تمام انصاف پسند لوگوں کے دل دہلا دیئے ہیں۔ غزّہ کے مظلوموں کے گلے سے آج حسینؑ کی آواز استغاثہ بلند ہورہی ہے جو یقیناً ان ہی کے دل ودماغ پر اثر کرسکتی ہے جو اپنے چندروزہ منافع کی ممکنہ بربادی کے ڈر سے اندھے اور بہرے نہ ہوگئے ہوں اس فریاد کا اثر ہر اس شخص پر یقیناً ہوگا جو خدا اور انسانوں کے سلسلہ میں اپنے فریضہ کا ذرا بھی احساس رکھتا ہوگا۔غزّہ کے اس فیصلہ کن معرکہ نے انشااللہ صیہونیوں کی مکمل تباہی کا سامان فراہم کررکھا ہے اور مظلوم فسلطینیوں کی فتح مبین قریب ہے۔

پانی ،غذا، دوا اور دوسرے تمام بنیادی امکانات سے محروم فلسطینی جوانوں کا سر سے پاؤں تک اصلحوں سے

لیس اور طاقت کے نشے میں چور دشمن سے دلیرانہ مقابلہ تاریخ کی تہوں میں محفوظ جالوت اور طالوت کی جنگ کی یاد دلاتا ہے فرق یہ ہے کہ آج داؤد جیسے دلیر جوان بنی اسرائیل میں نہیں مسلمانوں میں نظر آ رہے ہیں اور ظاہر ہے کے کامیابی داؤد صفت جوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس معرکہ میں عزّت کا بول بالا ہے اور ذلتوں کی کالک کئی مسلمان ملکوں کے سربراہوں کے چہروں پر اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ آج مصر، اردن، سعودی عرب، اور کویت جیسے ملکوں نے اپنی رسوائی کا سامان خود فراہم کر لیا ہے۔ ان ملکوں کے حکّام اپنے آقاؤں کی خوشی کے لئے اپنے اسلامی اور انسانی فریضہ کو بھی بھول گئے ہیں اور انہوں نے قرآن کے صاف حکم کو بھی ان سنا کر دیا ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے ''**یا ایھاالذین آمنوا لا تتخذوا الیھود و النصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض و من یتولھم منکم فانه منھم**''[1] اے ایمان والو یہود اور نصارا کو اپنا سرپرست اور دوست نہ بناؤ کیونکہ یہ لوگ آپس میں دوست ہیں (تمہارے دوست نہیں ہیں) اور جو انہیں اپنا دوست بنائے وہ ان ہی میں سے ہے۔

ان مسلمان ملکوں کو یہ خیال نہیں کہ اب ان کی غفلت اور ستمگری کا وقت گزر گیا ہے۔ قومیں بیدار ہو چکی ہیں اور حد بندیاں اور دیواریں ٹوٹنے والی ہیں اور جب یہ عمل شروع ہوگا تو اس سیلاب میں غاصب صیہونی اقتدار کے ساتھ ان کا تاج و تخت بھی بہہ جائے گا۔ اور وہ دن اب دور نہیں ہے۔

حوالہ

۱۔ فرہنگ جامع سخنان امام حسینؑ، تہیہ و تدوین: گروہ حدیث پژوہش باقر العلوم علیہ السلام، ناشر معروف قم بی تا۔

۲۔ نہج البلاغہ، صبحی صالحی، موسسہ دار الہجرۃ، قم بی۔تا۔

۱۔ سورہ مائدہ/۵۱

فکر و شعور

آخری قسط

اسلامی حکومت کے نظریاتی اصول

ایک فقہی تطبیقی جائزہ

۲۔سنت

تالیف:۔محمد مہدی آصفی

ترجمہ:۔سید شاہد حسین رضوی

روایت فضل بن شاذان

شیخ صدوقؒ اپنی دو کتاب ''عیون اخبار الرضاؑ [۱] '' اور ''علل الشرائع [۲] ''میں روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عبدالواحد بن محمد بن عبدوس نیشاپوری نے مجھے سے فرمایا کہ ان سے ابوالحسن علی بن محمد بن قتیبہ نیشاپوری نے کہا ان سے محمد بن فضل بن شاذان نے فرمایا:۔۔۔اگر یہ سوال کیا جائے کہ اولی الامر کو کیوں منصوب کیا گیا اور لوگوں کو ان کی پیروی کا کیوں حم ہوا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ: اس کی بہت سی علتیں ہیں، منجملہ جب بھی لوگوں کو ایک محدود اور معین حد سے تجاوز نہ کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اس سے انھیں روکا جائے کیوں کہ اس میں ان کے لئے برائی ہے تو یہ امر اپنے مقصد مقصود تک اسی وقت پہنچ سکتا

۱۔عیون اخبار الرضاؑ، ج ۲/ص ۹۷/، اس کتاب کی مذکورہ سند کے علاوہ مزید اضافہ کیا ہے۔اور حاکم ابومحمد جعفر بن نعیم بن شاذان نے اپنے چچا ابوعبد اللہ محمد بن شاذان سے نقل کیا ہے کہ فضل بن شاذان نے کہا۔

۲۔علل الشرائع، ص/۲۵۱

کہ اس سلسلہ میں ایک امین مقرر کیا جائے جو عوام کے لئے مباح امور کو اختیار کریا ور محرمات سے انھیں منع کرے اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو بہت سے لوگ شخصی فائدے اور لذت کو دوسروں کی برائی کے باوجود ترک نہیں کریں گے لہٰذا لوگوں کو فساد سے روکنے کے لئے کوئی نہ کوئی سرپرست مقرر ہونا چاہئے جو شرعی احکام اور الٰہی حدود کو ان کے درمیان نافذ کرے''

انھیں علتوں میں سے ایک علت یہ بھی ہے کہ ہمیں دنیا میں کوئی بھی فرقہ ایسا نہ ملے گا جو دنیا میں زندگی بسر رہا ہو مگر اپنی دینی و دنیاوی ضروریات میں سرپرست نہ رکھتا ہو، اسی لئے خداوند حکیم کے لئے یہ سزاوار نہیں ہے کہ لوگوں کو بغیر کسی رہبر کے یوں ہی چھوڑ دے جب کہ اسے یہ علم ہے کہ لوگوں کو رہبر کی ضرورت ہے اور ایک ایسے رہبر کے بغیر جس کے حکم سے لوگ دشمنوں سے جنگ کریں اور مال غنیمت تقسیم کریں اور اس کی اقتدا، میں نماز جمعہ و جماعت قائم کریں اور ظالموں کو مظلوموں پر ظلم وستم کرنے سے روکیں خود لوگوں کی بادشاہت اور دبدبہ ختم ہو کر رہ جائے گا''

نھیں علتوں میں سے ایک علت یہ بھی ہے کہ اگر رہبر جو کہ لوگوں کا سرپرست اور امین و حافظ ہوتا ہے خدا کی جانب سے منصوب نہ ہوتا تو امت کا خاتمہ ہو جاتا اور دین نابود ہو جاتا، الٰہی احکام اور سنت الٰہی بدل کر رہ جاتے اور بدعت گزار افراد اس میں اضافہ کرتے۔ ملحد اس میں کمیاں کرتے اور دین مسلمانوں کے لئے کہ مشتبہ ہو جاتا، اس لئے کہ ہم لوگوں کو ان داخلی اختلافات، مختلف خواہشات اور پریشان کن حالات کی بنیاد پر ناقص پاتے ہیں، لہٰذا اگر رسولؐ کی رسالت کا محافظ سرپرست لوگوں کے درمیان نہ ہوگا، تو جیسا کہ خود ہم نے پہلے بھی کیا ہے کہ لوگ فاسد ہو جائیں گے اور ایمان، احکام، سنت اور شریعت میں تبدیلیاں ہو جائیں گی جس کا نتیجہ تباہی و بربادی اور لوگوں میں فتنہ وفساد ہوا ہے۔

شیخ صدوقؒ اس طویل روایت کے آخر میں علی بن محمد بن قتیبہ نیشاپوری سے نقل کرتے ہیں: میں نے ان علتوں کو فضل بن شاذان سے سنا تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ تو بتائے کہ یہ علتیں جو آپ نے بیان کی ہیں آپ کا عقلی استنباط ہے یا کسی امام سے سن کر روایت کر رہے ہیں؟

تو انھوں نے مجھ سے کہا: کہ میں نہ تو جو کچھ خدا نے واجب کیا ہے اس سلسلہ میں اس کے ارادہ سے واقف تھا اور نہ تشریع کے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد سے اور نہ ہی میں اپنی طرف سے ان کی علت بیان کر رہا ہوں، بلکہ کبھی کبھی یکے بعد دیگرے اپنے مولا و آقا ابوالحسن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے سنا ہے اور اسے جمع کیا ہے، میں نے کہا کیا میں ان علتوں کو تمھارے ذریعہ اور امام رضا علیہ السلام کے حوالے سے نقل کر سکتا ہوں؟ تو انھوں نے کہا: جی ہاں

سند روایت کی توثیق

فضل بن شاذان امام علی النقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے موثق اصحاب میں سے ہیں، شیخ طوسیؒ نے کتاب فہرست میں، نجاشی اور دوسرے افراد نے ان کی قدر و منزلت اور جلالت کی تصریح فرمائی ہے۔

عبدالواحد بن محمد بن عبدوس عطار نیشاپوری صدوقؒ کے مشائخ میں سے ہیں اور صدوق نے اپنی کتاب ''مشیخہ'' [1] میں ان سے رضایت کا اظہار کیا ہے، اگر یہ مطلب ان کی وثاقت کو ثابت کرے تو ان کے ثقہ ہونے کی دلیل ہو ورنہ ان کی توثیق ہم تک نہیں پہنچی ہے ۔

علمائے رجال کے درمیان علی بن محمد بن قتیبہ نیشاپوری کے سلسلہ میں اختلاف ہے، بعض انھیں ثقہ سمجھتے ہیں، اس لئے کہ کشی نے اپنی کتاب رجال میں ان پر اعتماد کیا ہے اور اسی لئے شیخ طوسی نے ان کی فضیلت بیان کی ہے، اس کے برعکس، صاحب مدارک نے ان کی وثاقت کی تردید کی ہے آیت اللہ محقق خوئی کا بھی اسی نظریہ کی طرف رجحان ہے۔

روایت کی دلالت

ہر حال میں فضل بن شاذان کی روایت حکومت کی تشکیل کی ضرورت کے سلسلہ میں تین بنیادی نکتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۱۔ اجتماعی و سماجی اصول وضوابط کی حمایت، اجتماعی اصول وضوابط کے بغیر سکون واطمینان کی زندگی لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے، یہ اصول ضوابط، الٰہی حدود ہیں جو لوگوں کو دوسروں کے ظلم وستم سے پناہ دیتے ہیں اور انسانی غرائز اور نقل وحرکت کو کنٹرول کر کے انسانی زندگی کو نظم وضبط دیتے ہیں۔

۱۔ معجم رجال الحدیث، ج/۱۱ص/۳۶

ان اصول وقوانین کے تحفظ وحمایت کی ضرورت ہے اور یہ حمایت ونظارت کے بغیر انسان کی زندگی کو نظم وضبط دینے پر قادر نہیں ہیں اور حکومت ہی ہے جو اجتماعی اصول پر نظارت اور اجتماعی تجاوز کے مدمقابل ان قوانین کی حمایت کی ذمہ دار ہے۔

۲۔ ایک معاشرہ کو دفاع کے لئے ضروری اجتماعی خدمات کو مہیا کرنے، داخلی امن وامان صاف صفائی، دوائی، تعلیم وتعلم کے شعبہ بنیادی ساز وسامان اور اجتماعی زندگی کی دیگر تمام ضرورتوں کا محتاج ہے، ان خدمات کو انجام دینا ایک یا چند افراد کے بس کی بات نہیں ہے اس کے علاوہ کسی میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ وہ خود اپنی شخصی زندگی کی تمام ضروریات کو فراہم کر سکے۔

اجتماعی زندگی جس قدر ترقی کرتی جائے گی یہ ضرورتیں بھی بڑھتی جائیں گی اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر اور دشواریاں بڑھتی جائیں گی، ان تمام کاموں کو انجام دینا سوائے حکومت کے مخصوص ادارہ ودفاتر کے کسی اور کے بس میں نہیں ہے۔

۳۔ ایک جامعہ کی بنیادی ضروریات میں سے ایک یہ ہے کہ دین کی تخریب یا دین سے سوئے استفادہ نہ ہونے دے۔ دین جامعہ میں ایک عظیم طاقت ہے جو ہمیشہ تخریب وتاویل اور غلط فائدہ اٹھائے جانے کے خطرہ سے دوچار رہا ہے، لہٰذا ایک ایسی قوی طاقت کی ضرورت ہے جو دین سے غلط فائدہ اٹھانے یا دین میں تخریب میں کرنے سے مانع ہو اور دین کی حمایت کرے اور یہ طاقت، اسلامی حکومت ہے۔

فضل بن شاذان کی روایت میں یہ وہ بنیادی نکتے تھے جو اجتماعی زندگی میں حکومت کی تشکیل کی ضرورت کی توجیہ وتفسیر کر رہے ہیں، واضح سی بات ہے کہ یہ تین ضرورتیں کسی خاص زمانے سے مخصوص نہیں ہیں اور جس طرح امامؑ کی موجودگی میں ہوتی ہیں غیبت امامؑ کے زمانے میں بھی ہوتی ہیں، یہ تین ضرورتیں سبب ہیں کہ سارے مکلفین اسلامی حکومت کے قیام کی سعی وکوشش کریں۔

غزالی فرماتے ہیں:

دین کا نظام عبادت ومعرفت سے ہے جہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے مگر جسم کی صحت وسلامتی، حیات اور انسان کی بعض ضروریات کے صحیح وسالم ہونے سے جیسے لباس، گھر، امن وامان۔۔۔ انسان ہمیشہ اور ہر حال میں اپنی روح، بدن، مال گھر اور طاقت کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔۔۔ پس دین میں نظم وضبط نہیں ہو سکتا مگر ان ضروری ساز وسامان میں امن وامان کے تحقق کے ذریعہ، ورنہ وہ شخص کہ جو اپنی پوری زندگی ظالموں کی شمشیر سے اپنی جان کو محفوظ رکھنے کے چکر میں لگا ہے وہ کس طرح اور کب علم وعمل کو حاصل کرنے میں مشغول ہو سکتا ہے، جو آخرت میں کامیابی

کے دو وسیلے ہیں، پس معلوم ہوا کہ دنیا کا نظام، دین کے نظام کی شرط ہے۔[1]

غزالی آگے کہتے ہیں:

خلاصہ یہ کہ ایک عقلمند انسان یہ نہیں بھول سکتا کہ اگر لوگوں کو ان کے طبقاتی اختلاف، مختلف خواہشات اور متضاد نظریات کے باوجود خود انھیں پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی ایسا نظریہ نہ ہو جس کی وہ پیروی کریں کہ وہ انھیں متحد کر سکے، تو وہ ہر آن اپنے جیسے افراد کے ذریعہ نابود اور ختم ہو جائیں گے اور یہ ایسا درد ہے جس کی دوا کوئی نہیں مگر ایک قدرتمند حاکم جس کی دوسرے افراد اطاعت و پیروی کریں اور وہ (حاکم) ان کے درہم برہم نظریات کو یکجا کرے ۔۔۔لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا کے نظام کے لئے ایک حاکم کی ضرورت ہے اور دنیا کا نظام، دین کے نظام کے لئے ضروری ہے اور دینی نظام اخروی سعادت تک پہنچنے کے لئے ہے، جو انبیاءؑ کا مقصد رہا ہے۔

امام کا وجود ضرویات دین میں سے ہے جسے ترک کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔[2]

۳۔ عقل

دلیل عقل کو ہم قیاس استثنائی کی شکل میں بیان کر سکتے ہیں جو کہ دو مقدمہ اور ایک نتیجہ سے مرکب ہے۔

پہلا مقدمہ: ہر جامعہ کے لئے ایک حکومت کے وجود کی ضرورت سے مخصوص ہے، اس لئے کہ حکومت کے بغیر ایک اجتماعی زندگی بسر نہیں کی جا سکتی، وہ حکومت خواہ، حکومت عدل ہو جو دین خدا کے مطابق حکومت کرتی ہے خواہ حکومت ظلم ہو، یہ ایک عقلی مقدمہ ہے۔

دوسرا مقدمہ: ظالم حکومت کے ساتھ ساز باز یا تعلقات کا حرام ہونا اور اس سے مقابلہ کا واجب ہونا ہے، یہ ایک شرعی مقدمہ ہے۔

ان دو مقدموں سے حاصل ہونے والا نتیجہ، اسلامی حکومت کی تشکیل کا وجوب ہے پہلے مقدمہ میں ذکر شدہ ضرورت کو پورا کرنے اور طاغوت سے تعلقات ختم کرنے کی خاطر ہے جس کی حرمت دوسرے مقدمہ میں بیان کی ہے یہاں پر ہم ان دونوں مقدموں اور ان کے نتیجہ سے متعلق تفصیل پیش کرتے ہیں:

۱۔ الاقتصاد فی الاعتقاد، ص/۱۰۵۔۱۰۶

۲۔ الاقتصاد فی الاعتقاد، ص/۱۰۵۔۱۰۶

پہلا مقدمہ: لوگوں کی زندگی میں حکومت کی ضرورت

یہ پہلا مقدمہ ہے جس کا نام ہم نے عقلی مقدمہ رکھا ہے۔ لوگوں کی زندگی میں حکومت کی ضرورت کے بنیادی اہم نکتے تین ہیں:

۱۔ ضروری خدمات کو فراہم کرنا:

فطری بات ہے کہ، اس سلسلہ میں ایک یا چند افراد قدم نہیں اٹھا سکتے، یہ خدمات، ضروری، وسیع اور مادی ومعنوی اعتبار سے ایک بڑے پیمانہ پر ممکن ہیں، جیسے: عمومی کام کاج علاج ومعالجہ، صاف وصفائی، ارتباطات و تعلقات، تعلیم وتعلم کے امور، کھانے پینے کی چیزوں کو فراہم کرنا، لوگوں کی معاشی ضرورت اور ان کی زندگی کو منظّم کرنا یہ خدمات ہر دن ضروری سے ضروری تر اور مشکل سے مشکل تر ہوتی جارہی ہیں، محال ہے کہ ایک سماج کو اس کی ضرورت نہ ہو یا حکومتی اداروں کے علاوہ کوئی ایک شخص یا انجمن اس پر عمل کرے۔

لہٰذا اس قسم کی ذمہ داری انجام دینے کا لازمہ طاقت، اثر ورسوخ اور لوگوں کی زندگی پر حاوی ہونا ہے جو اداروں کو یہ امکان فراہم کرے کہ ان خدمات کو لوگوں کے لئے مہیا کرے اور انھیں اپنی اجتماعی زندگی میں اپنی اس ذمہ داری کو انجام دینے پر مجبور کرے۔۔۔ اور یہ کام سوائے حکومت کے کسی اور کے بس میں نہیں ہے۔

۲۔ قضاوت وحل اختلافات اور لوگوں کو حقوق کی رعایت پر مجبور کرنا:

یہ حکومت کا دوسرا فریضہ ہے، اسے چاہئے کہ لوگوں کی زندگی میں حقوق اور حدود کو مرتب کرے اور لوگوں کو ان ہی حقوق اور حدوں کے دائرے میں منظّم، لوگوں کے مشکلات واختلافات کو ان حدوں کے دائرے میں حل کرے اور ضرورت ہے ایک ایسی حاکمیت اور اثر ورسوخ کی جو لوگوں کو ان حدود کی پیروی کرنے کا پابند بنائے ۔۔۔۔ اور ان سارے کام کا لازمہ اجتماعی زندگی میں ایک حکومت کی تشکیل ہے۔

۳۔ لوگوں کی زندگی میں امن وامان برقرار کرنا:

بعض شرور افراد کے ظلم وستم اور بیرونی دشمن کے تجاوز کے مقابلہ لوگوں کو امن وامان میں رکھنا چاہئے اور بغیر کسی قدرت وطاقت اور اثر ورسوخ کے نہ تو ستمگر کے مقابلہ میں کھڑا ہونا ممکن ہے اور نہ ہی لوگوں کو امن وامان دینا ممکن ہے، یہ ضرورت، گزشتہ ضرورت سے جس کا سرچشمہ حقوق اور حدود میں لوگوں کا اختلاف تھا، فرق رکھتی ہے اور انھیں مواقع سے مخصوص ہے جہاں لوگ ایک دوسرے پر ظلم کررہے ہوں، ایسے میں حکومت لوگوں کے لئے امنیت،

ان کے دفاع اور حقوق کی حمایت کرنے کی ذمہ دار ہے۔

لوگوں کی زندگی میں حکومت کی تشکیل کی ضرورت کے یہی بنیادی اور اہم نکتہ ہیں، یہی ضروریات ہیں جو حکومت کی تشکیل کو ایک ضروری امر قرار دیتی ہیں، جن سے انسان کسی بھی صورت میں بے نیاز نہیں ہے، چاہے وہ حکومت ایک عادل حاکم کی ہو جو شرعی اصول پر قائم ہو یا ایک ظالم اور ستمگر کی منحرف حکومت ہو۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لا یصلح الناس الا امیر برا او فاجرا ، قالوا : یا امیر المومنین !هٰذا البر فکیف بالفاجر ؟ قال : ان الفاجر یومّن اللّٰه به السبیل ، و یجاهد به العدو ، و یجی به الفیء ، و یحج به البیت و یعبد الله فیه المسلم و آمناً حتی یاتیه اجله'' [1]

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

حاکم کے سوا کوئی اور لوگوں کی اصلاح نہیں کر سکتا خواہ وہ امیر نیک ہو یا بدکار و فاجر، لوگوں نے کہا: نیک حاکم تو ٹھیک ہے مگر فاجر و بدکار حاکم کس طرح؟ فرمایا: خداوند عالم اسی فاجر کے ذریعہ راستوں میں امن و امان قائم کراتا ہے، دشمنوں سے جنگ کرتا ہے، مال غنیمت اور مالیات ہاتھ آتا ہے، اس کے ذریعہ حج کرتا ہے اور مسلمان اسی کی امنیت کے زیر سایہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کی اجل آجائے۔

دوسرا مقدمہ

غیر اسلامی نظام (لائیک) جو اسلامی سرزمینوں پر حاکم ہے اپنی روزمرہ کی فعالیت میں بہت سے منکرات (برائیوں) کو انجام دیے رہا ہے اور طرح طرح کے ظلم و ستم کا مرتکب ہو رہا ہے یہ نظام لوگوں کے حقوق پر تجاوز اور ظلم کئے بغیر اپنے روزآنہ کے حکم کو نافذ نہیں کر سکتا۔

اگر فرض کیا جائے کہ ایک لائیک نظام لوگوں کی زندگی میں عدل و انصاف سے کام لے اور رعایا پر ظلم نہ کرے، الٰہی حدود کو پائمال نہ کرے تو یہ صرف ایک خیال خام اور واقعیت سے خالی ہوگا۔

۱۔ کنز العمال، ج/۵، ص/۷۵۱، ح/۱۴۲۸۶

یہ مسئلہ تاریخ میں ہمارے اس دور کی زندگی سے فرق نہیں رکھتا اگر کوئی شخص اسلام کی تاریخ میں ان حکومتوں کے ذریعہ ہونے والے مظالم، تجاوز، برائیوں کے مرتکب ہونے اور شریعت اسلام والٰہی حدود سے منحرف ہونے کی تائید کرتا ہے تو وہ ہماری اس بحث کے نتیجہ کی تائید کر رہا ہے۔

یہ نظام پانچ شرعی حکم کا موضوع ہیں جو ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں:

۱۔ان نظاموں پر اطمینان اور بھروسہ کرنا حرام ہے۔

۲۔مسلمانوں پر کافروں کی حاکمیت وسیادت قبول کرنا حرام ہے۔

۳۔کفر سے انکار اور طاغوت کا انکار کرنا۔

۴۔طاغوت سے جہاد کا وجوب۔

۵۔اسراف کرنے والوں کی اطاعت کو حرام قرار دینا۔

یہاں ہم ان پانچ موضوعات کی مختصر توضیح دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی تشریح وتفسیر اس سے متعلق تفصیلی کتابوں کے حوالے کرتے ہیں:

۱۔ ظالموں پر اطمینان اور بھروسہ کرنا حرام ہے:

خداوند عالم نے ظالموں پر اعتماد اور بھروسہ کرنے اور ان کے افعال پر راضی ہونے کو ہم پر حرام قرار دیا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

" و لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار... " (ہود/۱۱۳)

اور مسلمانوں جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کی طرف مائل مت ہونا ورنہ تم تک بھی (دوزخ کی) آگ آ لپٹے گی۔۔۔

"رکون"، ستمگر اور ظالم پر اطمینان ان کی طرف میلان، ان سے آرام وسکون کا یقین اور ان کی حکومت و سروری قبول کرنا، حرام ہے۔

علمائے لغت کہتے ہیں: الرکون: الادھان (مدارا کرنا اور ساز باز کرنا) والمصافحہ (سازگاری) والحب (دوستی) والمودۃ (مودت) والطاعۃ (اطاعت) والرضا (رضایت وخوشنودی) والمیل (میلان) والاستعانہ (مدد چاہنا) والدنو (قربت)

جو بھی شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتا اور الٰہی حدود سے تجاوز کرتا ہے یقیناً وہ

ظالموں میں سے ہے۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

" و من یتعد حدود اللّٰہ فاولئک ھم الظالمون " (بقرہ/۲۲۹)

او جو بھی الٰہی حدود سے تجاوز کرتا ہے، پس ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔

" و من لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الکافرون "

(مائدہ/۴۴)

او جو بھی خدا وند عالم کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتا ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔

بلا شبہ خدا کی شریعت سے دور ظالم و جابر کی حکومت و نظام جس میں ایک ظالم انسان حکومت کر رہا ہے، کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا اور اس کی سیادت و حاکمیت کو قبول کرنا، اس کے اداروں کے ساتھ ہم آہنگی اور اس کے حکم وارادہ کے ساتھ ساتھ ہونا یا ایسے نظام جسے اس نے لوگوں کی حمایت کے لئے قرار دیا ہے کے ساتھ تعاون و ہمدردی یا لوگوں پر تھوپے گئے قانون میں اس کے ساتھ ہمدردی یہ تمام چیزیں، ظالم کی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے اور اس پر اعتماد واطمینان، بھروسہ اور اس کی جانب میلان کے واضح مصداق ہیں۔ جسے خداوند عالم نے حرام قرار دیا ہے اور صراحت کے ساتھ اس سے منع کیا ہے۔

زمخشری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ارکنہ: جب اسے مائل کیا "رکون" سے منع و نہی کرنا اس آیت میں چند چیزوں کو شامل ہے: ظالم سے دوستی اور میلان اور وابستہ ہونا ہمراہی، ہم نشینی، ملاقات، مدارا اور سازش کرنا، ان (ظالموں) کے کاموں سے راضی ہونا خود کو ان کی طرح قرار دینا اور ظالموں کی طرح رہنا ان کے جاہ وحشم سے مرعوب ہونا اور ان (ظالموں) کا تذکرہ اس طرح کرنا کہ اس سے ان کی تعظیم شمار ہو۔

حکایت میں ہے کہ موفق نے امام جماعت کے پیچھے نماز پڑھی اور امام نے یہ آیت "ولا ترکنوا الیٰ الذین ظلموا فتمسکم النار " (ہود/۱۱۳) کی تلاوت کی، تو موفق بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں نے اس کا سبب پوچھا کہا: یہ اس کی صورت حال ہے جو ظالم پر اعتماد اور بھروسہ کرے تو خود ظالم کا کیا حال ہوگا۔

حسن بصری سے منقول ہے کہ: خداوند عالم نے دین کو دو "لا" کے درمیان قرار دیا ہے: "لا تطغوا و لا

ترکنوا ''

جب (محمد بن شہاب) زہری سلاطین کے ساتھ مل گیا اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تو ایک دینی وایمانی بھائی (امام زین العابدین علیہ السلام) نے اس کے پاس لکھا:

''ابوبکر! خداوند عالم ہم سب کو فتنہ سے محفوظ رکھے، اس وقت تم ایسی حالت میں ہو کہ تمھیں پہچاننے والے کو چاہئے کہ تمھارے لئے خداوند عالم کی بارگاہ میں دعا کرے کہ وہ تم پر اپنی رحمت نازل کرے، بوڑھے ہو گئے ہو، اور خدا کی نعمتوں نے تمھاری ذمہ داری سنگین کر دی ہے کہ اس نے تمھیں اپنی کتاب میں بتا رکھا ہے اور سنت پیغمبرؐ کی بھی تمھیں تعلیم دی ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ خداوند عالم نے علماء سے عہد و پیمان لیا ہے اور فرمایا ہے: '' **لتبینہ للناس و لا تکتمونہ** '' کہ اسے لوگوں کے لئے بیان کرو اور کتمان مت کرو۔

جان لو کہ سب سے پست جرم کے جو مرتکب ہوئے ہو اور اپنے اوپر پست ترین بوجھ اٹھائے ہو وہ یہ ہے کہ تم ظالم کی وحشت سے مانوس ہو گئے ہو اور ایک ایسے شخص سے قریب ہو کر جو نہ تو کوئی حق ادا کرتا ہے اور نہ ہی کسی باطل کام کو ترک کرتا ہے تم نے بغاوت و سرکشی کا راستہ آسان کر دیا ہے، جب انھوں (ظالموں) نے تمھیں خود سے نزدیک کیا ہے تو تمھیں ایسا محور بنا دیا کہ ان کے باطل امور تمھارے گرد چکر لگائیں اور تمھیں اپنے لئے زینہ قرار دیا ہے تا کہ اپنے خواہشات تک پہنچ سکیں اور تمھیں وہ سیڑھی قرار دیا ہے جس کے ذریعہ وہ گمراہی وضلالت کی معراج تک پہنچیں، تمھارے ذریعہ علماء کو شک وشبہ میں ڈالیں گے اور جاہلوں کے دلوں کو تمھارے ذریعہ اپنی طرف مائل کریں گے، ان لوگوں (ظالموں) نے تمھارے لئے جو کچھ بنایا ہے وہ تمھارے لئے خراب کرنے سے بہت کم ہے، جو کچھ انھوں نے تم سے لیا ہے وہ بہت زیادہ ہے (اس سے جو انھوں نے تمھیں دیا ہے اور جو کچھ انھوں نے تمھاری مصلحت میں کیا ہے) وہ تمھارے دین کو تباہ کرنے کے مقابل میں کچھ نہیں ہے تمھیں یہ کیسے اطمینان ہے کہ تم ان لوگوں کے زمرہ میں نہیں ہو جن کے بارے میں خداوند عالم نے فرمایا ہے:

''فخلف من بعد هم خلف اضاعوا الصلاة و التبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا''(مریم/۵۹)

پھران کے بعد کچھ ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نمازیں کھوئیں اورنفسانی خواہشوں کے چیلے بن بیٹھے عنقریب یہ لوگ (اپنی) گمراہی (کے خمیازے) بھگتیں گے۔

تم ان لوگوں کے ساتھ کام کررہے تو جوانجانے نہیں ہیں اورایسے افرادتمھاری ہی حمایت کررہے ہیں جولوگوں کی آنکھوں سے نہاں نہیں، اپنے دین کی دوا کروجس میں مرض رسوخ کرگیا ہے اوراپنا زادسفرمہیا کروکہ وقت نزدیک آگیا ہے یقیناً زمین وآسمان کا ذرہ ذرہ خداوندعالم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

والسلام

سفیان کا کہنا ہے:

دوزخ میں ایک ایسی وادی ہے جس میں کوئی نہیں جائے گا سوائے ان قاریوں کے جو بادشاہوں کی ملاقات کوجاتے ہیں۔

اوزاعی سے منقول ہے کہ: خدا کے نزدیک منفورترین وہ عالم ہے جوظالم کے ساتھ تعاون کرے۔

محمد بن مسلمہ نے بھی کہا ہے: گندگی کی مکھی ان (ظالموں) کے دربار میں رہنے والے قاری قرآن سے بہتر ہے۔

رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''من دعا لظالم بالبقاء فقد احب ان يعصى الله فى ارضه''[1]

جوبھی کسی ظالم کی بقا کے لئے دعا کرے، یقیناًوہ یہی چاہتا ہے کہ خدا کی زمین پراس کی معصیت انجام پائے۔

سفیان سے ایسے ظالم کے بارے میں پوچھا گیا جواپنی قوم کے درمیان ہلاک ہورہا ہے: کیااس (ظالم)

۱۔اس روایت کوبیہقی نے حسن کے حوالے سے یونس سے روایت کرکے''شعب الایمان'' کے(۶۶ویں) شعبہ میں نقل کیا ہے،ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیا میں سفیان ثوری سے نقل کیا ہے۔

کو ایک چلو پانی دیا جا سکتا ہے؟ جواب دیا نہیں۔ لوگوں نے کہا وہ مر رہا ہے؟ کہا: اسے چھوڑ دو یہاں تک کہ مر جائے۔ [1]

قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ولا ترکنوا'' ''رکون'' حقیقت میں کسی چیز پر تکیہ کرنا، اعتماد و بھروسہ کرنا، اس کے ساتھ رہنا اور اس سے راضی و خوشنود ہونا ہے، قتادہ کہتے ہیں: یعنی انھیں (ظالموں کو) دوست نہ رکھو ان کی اطاعت نہ کرو؛ ابن جریج کہتے ہیں: ان (ظالموں) کی طرف مائل نہ ہو؛ ابو العالیہ کہتے ہیں: ان کے کاموں سے راضی نہ ہو. یہ تمام نظریات ایک دوسرے سے نزدیک ہیں؛ ابن زید کہتے ہیں: ''رکون'' مدارا کرنا اور سازش کرنا ہے۔

الذین ظلموا کی تفسیر میں لکھتے ہیں: کہا گیا ہے: اہل شرک (مشرک)؛ بعض نے کہا ہے یہ لفظ عام ہے جو مشرکوں اور گنہ گاروں کو شامل ہے جیسے خداوند عالم کا یہ قول: ''واذا رایت الذین یخوضون فی آیاتنا'' (سورۂ انعام: ۶۸)

''اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں بیہودہ بحث کر رہے ہیں'' اس سے پہلے ہم نے اس بارے میں بحث کی ہے اس آیت کے معنی میں یہی قول صحیح ہے اور یہ کہ یہ آیت کافروں اور گنہ گاروں سے کنارہ کشی کرنے پر دلالت کرتی ہے یعنی بدعت گزار وغیرہ. [2]

ابن کثیر آیت ''ولا ترکنوا الی الذین ظلموا'' کی تفسیر میں کہتے ہیں:

ابن عباس سے منقول ہے کہ: ان (ظالموں) کے ساتھ ساز باز مت کرو.

ابو العالیہ کہتے ہیں: ان کاموں سے خوشنود مت ہو؛ ابن جریر کہتے ہیں: ابن عباس سے منقول ہے کہ: ستم کرنے والوں کی طرف مائل مت ہو، یہ بہترین قول ہے یعنی ستمگروں سے مدد طلب نہ کرو جس سے یہ پتا چلے کہ تم گو یا ان کے کاموں سے راضی ہو، ''فتمسکم النار'': تو (دوزخ) کی آگ تمھیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ [3]

۱۔ الکشاف فی تفسیر القرآن، ج ۲/ص ۴۳۳/۴۳۴۔

۲۔ الجامع الاحکام القرآن، ج ۹/ص ۱۰۸/.

۳۔ تفسیر القرآن العظیم، ج ۲/ص ۴۶۱/.

سید قطب آیت ''ولاترکنوا الی الذین ظلموا'' کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ظالم و جابر اور طاغوتوں، روئے زمین پر اقتدار رکھنے والے جو کہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر خدا کے بندوں کو پسپا کر کے انھیں دوسرے بندوں کا غلام بنا دیتے ہیں ان پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرنا اس لئے کہ ان پر اعتماد کرنے کا مطلب ہے منکرات (محرمات) جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں، کی تائید کرنا اور اس عظیم حرام کام میں ان کے ساتھ گناہ میں شریک ہونا ہے۔[1]

یہ ایک مختصر گوشہ ہے، مفسرین کے کلام کا جو انھوں نے ''ولا ترکنوا الی الذین ظلموا'' کی تفسیر میں ظالموں پر اعتماد اور بھروسہ کی اس طرح نہی کی ہے: ان (ظالموں) کی طرف مائل نہ ہونا، ان سے آرام کا مطالبہ نہ کرنا، ان سے مودت طلب نہ کرنا، ان کے کاموں سے راضی نہ ہونا، ان کے ساتھ صلح و مصالحت نہ کرنا، ان کو دوست نہ رکھنا، ان کی پیروی نہ کرنا، ان سے خوشنود نہ ہونا اور ان کی تائید نہ کرنا، ظالم یقیناً وہی معصیت کار نافرماں افراد ہیں۔

اگر گزشتہ مطالب قرآن مجید کی تصریح کے مطابق حرام ہیں تو ان کے ساتھ رہنا ان کی جماعت میں ہونا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟!

۲۔ کافر کی سروری و سیادت اور اثر و رسوخ کو قبول کرنا حرام ہے

دوسرا حکم: مومنین پر کافروں کی سرداری اور نفوذ قبول کرنا حرام ہے. خداوند عالم نے مومنین کو کافروں کی سرداری قبول کرنے سے منع کیا ہے اور مومنین پر کافروں کی اطاعت اور فرمانبرداری حرام قرار دی ہے. ارشاد ہوتا ہے:

''ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا'' (سورۂ نساء:۱۴۱)

''اور خداوند عالم نے کافروں کو مومنین پر مسلط ہونے کی ہرگز کوئی راہ نہیں قرار دی''

قرآن مجید کا یہ صریح حکم آیات محکم میں موجود ہے، اس آیت میں سبیل (راہ) نفوذ و سلطنت ہے جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے علاوہ دوسری بنیاد پر لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں قرآن کی صراحت کے مطابق کافروں کا مصداق ہیں:

۱۔ تفسیر فی ظلال القرآن، ج ۱۲، ص ۱۴۷

''ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون'' (سورۂ مائدہ:۴۴)

''اور جو شخص خدا کی نازل کی ہوئی (کتاب) کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں''

سورۂ مائدہ کی آیت سبیل میں سبیل کے معنی اس سلطنت کو قبول کرنے سے پرہیز کرنا اور کافروں کے مومنین پر اثر ورسوخ سے انکار کرنا ہے. (نفی تشریعی سبیل) نہ کہ اس کی تکوینی نفی، اس لئے کہ تاریخ میں بہت سے مواقع پر تکوینی لحاظ سے کافر مومنین پر مسلط رہے ہیں اور آج بھی اس اعتبار سے بعض اسلامی علاقوں میں یہ صورت حال موجود ہے اور کافر مومنین پر مسلط ہیں۔

لہٰذا سورۂ مائدہ میں نفی سبیل کا مقصد نفی تشریعی ہے یعنی کافر کے مسلمانوں پر نفوذ سے پرہیز کرنا اور ان کے نفوذ کی تحریم ہے نہ کہ اس کی تکوینی نفی ہے۔

قرطبی نے اس آیت کی تفسیر کے وقت اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

خداوند عالم نے شرعی لحاظ سے کافروں کو مومنین پر مسلط نہیں کیا ہے، ہر چند شریعت کے خلاف اس طرح کی سلطنت موجود رہی ہے۔

وہ ابن العربی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہمارے علماء نے اس آیت کے ذریعہ کافروں کے خلاف دلیل پیش کی ہے کہ وہ مسلمان کو غلام بنا کر ان کے مالک نہیں بن سکتے؛ اشہب اور شافعی کا بھی یہی نظریہ ہے، اس لئے کہ خداوند عالم نے مسلمانوں پر کافروں کے تسلط (سبیل) کی نفی کی ہے لہٰذا اس طرح کا تسلط شرعی نہیں ہے اور اس طرح عقد بیع نافذ (منعقد) نہیں ہوگا۔[1]

ہم بھی اس آیت سے اسی نظریہ کا استفادہ کریں گے۔

۳۔ طاغوت سے انکار اور اسے رد کرنا

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

''یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت و قد امروا ان یکفروا به'' (سورۂ نساء:۶۰)

۱۔ گزشتہ حوالہ، ص/۴۲۱.

اور وہ چاہتے ہیں کہ سرکشوں کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کی بات نہ مانیں۔

راغب اصفہانی کہتے ہیں:

طاغوت: یعنی ہر متجاوز اور خداوند عالم کے سوا ہر معبود، اسی وجہ سے ساحر، کاہن اور راہ حق سے منحرف افراد کو طاغوت (سرکش) کہا گیا ہے۔[1]

ایک یہودی اور ایک منافق میں جھگڑا ہوا منافق یہودی کو فیصلہ کے لئے یہودیوں کے پاس لے جارہا تھا اس لئے کہ اسے یہ معلوم تھا کہ یہودی رشوت لیتے ہیں اور یہودی منافق کو مسلمانوں کے پاس لے جارہا تھا اس لئے کہ اسے علم تھا کہ مسلمان رشوت نہیں لیتے، دونوں نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلہ کو جہینہ کے لوگوں کے ایک کاہن کی خدمت میں پیش کیا جائے تو خداوند عالم نے اس سلسلہ میں یہ آیت نازل فرمائی:

"الم تر الی الذین یزعمون انهم امنوا بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به و یرید الشیطان ان یضلهم ضلالا بعیدا"

(سورۂ نساء:۶۰)

کیا تم نے ان لوگوں (کی حالت) پر نظر نہیں کی جو یہ خیال کرتے ہیں کہ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل کی گئی ہیں (سب پر) ایمان لائے ہیں پھر بھی چاہتے ہیں کہ سرکشوں کا اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کی بات نہ مانیں اور شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انھیں بہکا کے بہت دور لے جائے۔

ثعلبی اور ابن حاتم نے ابن عباس کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ منافقوں میں سے ایک شخص نے جس کا نام بشر تھا ایک یہودی سے جھگڑا کیا، یہودی نے اسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بلایا اور منافق نے اسے کعب بن اشرف کے پاس بلایا... لہٰذا طاغوت، کعب بن اشرف ہے۔[2]

۱۔ مفردات الفاظ القرآن، ص/۳۰۵۔

۲۔ تفسیر روح المعانی، ج/۵، ص/۶۸۔

اس لحاظ سے، طاغوت، خدا اور رسول کے خلاف طغیان کرنے (سرکشی) سے لیا گیا ہے، آلوسی کہتے ہیں ؛اس (کعب بن اشرف) پر طاغوت کا اطلاق ہونا حقیقت میں ''کثیر الطغیان'' کے معنی میں ہے۔[1]

بروسوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

طاغوت، کعب بن اشرف ہے .وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی اور طغیان میں افراط کی وجہ سے طاغوت کہا جانے لگا اور جو شخص باطل کے ذریعہ حکم کرے یا غلط طریقہ سے برتری چاہے وہ بھی اسی معنی میں ہے۔ [2]

سیوطی لکھتے ہیں:

الطاغوت: ایک یہودی شخص بنام کعب بن اشرف ہے، جب بھی لوگ احکام الٰہی کی طرف بلائے جاتے تھے اور ان سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کریں تا کہ ان کے درمیان آپؐ فیصلہ کریں تو وہ لوگ کہتے تھے ہم اس دعوے کو کعب بن اشرف کی خدمت میں پیش کریں گے لہٰذا ارشاد ہوا: ''**یریدون ان یتحاکموا الیٰ الطاغوت**'' [3]

اس تفسیر کی بنیاد پر، خدا کے علاوہ جابر و ظالم حکام و امراء جو حکمرانی کر رہے ہیں اور خدا کے بندوں پر ظلم و ستم کر رہے ہیں، الٰہی حدوں کو توڑ رہے ہیں، طاغوت کا واضح اور روشن مصداق ہیں۔ طاغوت سے انکار: یعنی طاغوت سے دوری اختیار کر کے انھیں رد کرنا اور معاشرہ میں ان کے حکم کو ٹھکرانا اور مقام و منصب اور قدرت سے ان کی نفی کرنا اور ان کے منصب کا انکار کرنا ہے۔

راغب اصفہانی فرماتے ہیں: کبھی کبھی تبرأ یعنی کفر سے بیزاری سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جیسے:

''**ثم یوم القیامة یکفر بعضکم ببعض ...**'' (عنکبوت/۲۵)

پھر قیامت کے دن ایک، دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔

''**انی کفرت بما اشرکتمون ...**'' (ابراہیم/۲۲)

میں تو اس سے پہلے ہی سے بیزار ہوں کہ تم نے مجھے خدا کا شریک بنایا۔

۱۔ ہمان.

۲۔ تفسیر روح البیان، ج/۲، ص/۲۳۰.

۳۔ الدر المنثور، ج/۲، ص/۱۷۹

جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے اور شیطان کی مخالفت کرتا ہے تو کہا جاتا ہے: ''کفر فلان بالشیطان'' فلاں شخص شیطان سے بیزار ہوا جیسے خداوند عالم کا یہ قول:

''فمن یکفر بالطاغوت و یومن بالله...'' (بقرہ/۲۵۶)

جس نے طاغوت (جھوٹے خداؤں) سے انکار کیا اور خدا پر ایمان لایا۔۔۔

اس آیت میں بیزاری وانکار صرف دل سے کامل نہیں ہوتا بلکہ طاغوت سے مقابلہ کے ذریعہ شیطان اور طاغوت سے بیزاری پایہ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ علامہ سید محمد حسین طباطبائی تفسیر المیزان میں لکھتے ہیں: سورہ نحل آیت نمبر ۳۶ میں اس حالت کو طاغوت سے بیزاری سے تعبیر کیا گیا ہے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔

''لقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا الله و اجتنبوا الطاغوت...'' (نحل/۳۶)

ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے بھیجا کہ لوگو! خدا کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔

اجتناب کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خود کو طاغوت کی توصیف اس کے اثر ورسوخ سے دور رکھے اور اپنے آپ کو طاغوت سے الگ تھلگ رکھے اور اپنی اس دوری اور بیزاری کا علی الاعلان اظہار کرے۔

طاغوت کی عبادت

طاغوت سے اجتناب و بیزاری اور اس سے انکار کے مد مقابل طاغوت کی عبادت کا مفہوم ہے۔ طاغوت کی عبادت کا مطلب اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

''والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوها و انابوا الی الله لهم البشری'' (زمر/۱۷)

اور جو لوگ طاغوت سے ان کے پوجنے سے بچے رہے اور خدا ہی کی طرف رجوع کیا ان کے لئے (جنت) کی خوشخبری ہے۔

طاغوت کی عبادت کا مطلب اس کی اطاعت وفرمانبرداری ہے۔

مجمع البیان میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

’’ من اطاع جبارا فقد عبده‘‘ [1]

جوشخص کسی ظالم کی اطاعت کرے یقیناً اس نے اس کی عبادت کی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

’’ مر عیسی بن مریم علی قریة قد مات اهلها فاحیی احدهم و قال له : و یحکم ما کانت اعمالکم ؟ قال : عبادة الطاغوت و حب الدنیا قال : کیف کانت عبادتکم للطاغوت ؟ فقال : الطاعة لاهل المعاصی‘‘ [2]

حضرت عیسیٰ ایک گاؤں سے گزرے جہاں کے لوگ مر چکے تھے، ان میں سے ایک کو زندہ کر کے اس سے کہا: وائے ہو تم پر تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ اس نے کہا: طاغوت کی عبادت اور دنیا سے محبت، حضرت عیسیٰؑ نے کہا: کس طرح طاغوت کی عبادت کرتے تھے، اس نے کہا: گنہگاروں کی اطاعت کرتے تھے۔

اسی لئے خداوند عالم نے طاغوت پر اعتماد و بھروسہ کرنے اور اس سے فیصلہ کروانے کو حرام قرار دیا ہے، اور لوگوں کو خواہ حق ہو یا باطل ہو اس (طاغوت) کے فرمان سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے، طاغوت کی اطاعت و پیروی معصیت الٰہی سے ہٹ کر اس کی حمایت بھی ہے جو مسلمانوں پر اس کے تسلط کا سبب بنتی ہے۔

روایت مقبولہ عمر بن حنظلہ میں آیا ہے کہ:

’’ سالت ابا عبد الله (ع) عن رجلین من اصحابنا بینهما منازعة فی دین او میراث، فتحاکما الی السلطان و الی القضاة ، ایحل ذلک ؟ قال : من تحاکم الیهم فی حق او باطل فانما تحاکم الی الطاغوت و ما یحکم له فانما یاخذ سحتا و ان کان حقا ثالثا له لانه اخذه بحکم الطاغوت و ما امر الله ان یکفر به

۱۔ مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج/۸ص/۴۳۲

۲۔ نور الثقلین، ج/۵ص/۵۳۱، میزان الحکمہ، ج/۵ص/۵۴۳

قال اللہ تعالی : یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت و قد امروا ان یکفروا بہ ''[1]

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اپنے دو دوستوں کے بارے میں سوال کیا جن میں قرض یا میراث سے متعلق اختلاف تھا وہ سلطان یا قاضیوں کے پاس مسئلہ پیش کرتے ہیں اور فیصلہ چاہتے ہیں، کیا یہ کام جائز ہے؟ آپؑ نے فرمایا: جو شخص بھی ان سے فیصلہ چاہے خواہ حق ہو یا باطل، یقیناً اس نے طاغوت سے فیصلہ چاہا کیا ہے اور جو بھی اس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے اس کا لینا حرام ہے اگر چہ اس کا مسلم حق ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ اسے اس (شخص) نے طاغوت کے حکم اور اس کے فیصلہ سے حاصل کیا ہے جس سے اجتناب کا حکم خداوند عالم نے دیا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے ''**یتحاکمو الی الطاغوت و قد امروا یکفروا بہ**''

۴۔ طاغوت سے جہاد کا وجوب

اس سلسلہ میں وارد ہونے والی روایتیں بہت زیادہ ہیں ان میں سے کچھ روایتیں نمونہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں، ثقۃ الاسلام کلینی اپنی سند کے حوالے سے امام محمد باقرؑ سے نقل کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا:

فانکروا بقلوبکم والفظوا بالسنتکم و صکّوا بھا جباھم ولا تخافوا فی اللہ لو مۃ لائم ...فان اتّعظوا و الی الحق رجعوا فلا سبیل علیھم :

''انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق او لئک لھم عذاب الیم '' (سورۂ شوریٰ ۴۲/)

ھناک فجا ھدوھم بابدانکم وابغضوھم بقلوبکم غیر طالبین سلطاناً

اپنے دل سے انکار کے ساتھ ساتھ اپنی زبان پر لے آؤ اور اسے (برائت کو) ان (طاغوتوں) کی

۱۔ وسائل الشیعہ، ج/۱۸، ص/۹۸۔۹۹ ح/۱، دیکھئے حوار فی التسامح، ص/۵۹۔۶۳

پیشانیوں پر مارو اور خدا کی راہ میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہ ڈرو...اگر وہ نصیحت قبول کر کے حق کی جانب پلٹ جاتے ہیں تو ان پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: مذمت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور روئے زمین پر ناحق طغیان وسرکشی کرتے ہیں اور فتنہ برپا کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

ایسے میں تم ان سے اپنے جسم کے ذریعہ جہاد کرو اور دل سے ان سے بیزار رہو مگر قدرت وسلطنت کی چاہت نہیں ہونی چاہئے۔

یحییٰ الطّویل امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

ما جعل الله بسط اللسان و كف اليد ولكن جعلهما يبسطان معاً و يكفان معاً

خداوند عالم نے زبان کو کھول کر ہاتھ باندھ نہیں رکھا ہے یقیناً یہ دونوں ایک ہی ساتھ کھلتے اور ایک ساتھ بند ہوتے ہیں.

شریف رضی نے نہج البلاغہ میں امام علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے جنگ صفین کے موقع پر فرمایا:

" ايها المومنون ! من راى عدوانا يعمل به و منكرا يدعى اليه فانكره بقلبه فقد سلم و برئ و من انكره بلسانه فقد اجر وهو افضل من صاحبه ، و من انكره با لسيف لتكون كلمة الله هى العليا و كلمة الظالمين هى السفلى فذالک الذين اصاب سبيل الهدى و قام على الطريق و نور فى قلبه اليقين"

اے ایماندارو! اگر کوئی دیکھے کہ دشمنی وظلم وستم پر عمل کیا جارہا ہے یا لوگوں کو منکرات کی طرف بلایا جارہا ہے۔ لیکن وہ دل سے اسے پسند نہیں کررہا ہے تو وہ شخص گناہوں سے دور اور سالم ہے اور جو زبان سے اس کا انکار کرے اسے اجر ملا اور وہ دل سے انکار کرنے والے سے افضل ہے اور جس نے تلوار کے ذریعہ انکار کیا تا کہ اللہ کا نام بلند ہو اور ظالمین کی بات پست ہو تو ایسا شخص ہدایت کے راستہ تک پہنچ گیا اور ہدایت پر قائم ہے

اور یقین وایمان کا نور اس کے دل میں درخشاں ہو گیا۔

اس مضمون کی روایتیں بہت زیادہ ہیں جو متواتر ہیں لہٰذا ان کی سند کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اہل سنت سے اس سے متعلق بہت سی روایتیں منقول ہیں ترمذی نے طارق بن شہاب سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا:

''سب سے پہلا شخص جس نے خطبہ کو نماز پر مقدم کیا وہ مروان بن حکم تھا تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: تم نے سنت کی مخالفت کی ہے ابوسعید نے کہا: اس شخص نے اپنا فریضہ انجام دیا ہے، میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا:

''من رای منکرا فلینکر بیده و من لم یستطع فبلسانه ، و من لم یستطع فبقلبه و ذالک اضعف الایمان''

جو بھی شخص منکر کو انجام ہوتے دیکھے اسے چاہئے کہ ہاتھ کے ذریعہ اس کا انکار کرے اور جو یہ نہ کر سکے وہ زبان سے اس کا انکار کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے کرے اور یہ ایمان کا سب سے پست درجہ ہے۔

ابوعیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔[1] احمد بن حنبل نے اس روایت کو اپنی کتاب ''مسند'' میں دو جگہ ذکر کیا ہے۔[2] مسلم نے بھی انھیں جیسے الفاظ میں اپنی کتاب ''صحیح'' میں نقل کیا ہے[3] ابن ماجہ اور نسائی نے بھی اسے اپنی کتاب ''سنن'' میں نقل کیا ہے۔[4]

ہم اس مفہوم کی تمام حدیثوں کو بیان کرنا نہیں چاہتے اس لئے کہ وہ بہت زیادہ ہیں جو معنوی تواتر کی حد تک پہنچی ہیں، ہم اس بحث کا اختتام سبط نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی روایت سے کرتے ہیں۔ جسے منطقہ البیضہ میں مورخین کے بقول آپ نے اپنے نانا رسول خداؐ سے نقل کیا ہے، آپؑ حر بن یزید تمیمی کے کتیبہ میں خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

۱۔ سنن ترمذی، ج ۴/ص ۴۶۹۔۴۷۰، ح ۲۱۷۲/۲، کتاب الفتن، باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید واللسان۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۳/ص ۱۰۔۴۵

۳۔ صحیح مسلم، ج ۱/ص ۵۰

۴۔ سنن بن ماجہ، ج ۲/ص ۱۳۳۰، سنن نسائی، (شرح سیوطی)، ج ۸/ص ۱۱۱۔۱۱۲

''یا ایھا الناس ! ان رسول اللّٰہ قال : من رای منکم سلطانا جائر مستحلا لحرام اللّٰہ ناکثا لعھد اللّٰہ مخالفا لسنۃ رسول اللّٰہ یعمل فی عباد اللّٰہ بالا ثم والعدوان فلم یغیر علیہ بفعل و لا قول کان حقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ ''[1]

اے لوگوں! رسول خداؐ نے فرمایا ہے تم میں سے جو بھی شخص کسی ظالم بادشاہ کو حرام خدا کو حلال کرتے، وعدہ الٰہی کو توڑتے ، سنت نبوی کی مخالفت کرتے اور بندگان خدا کے درمیان معصیت وتجاوز کرتے دیکھے اور وہ شخص اپنے عمل یا قول کے ذریعہ اس ظالم بادشاہ کی مخالفت نہ کرے تو خدا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس شخص کو اس کے مقام (جہنم) کے حوالے کردے۔

۵۔ مسرفوں، مفسدوں اور گنہگاروں کی اطاعت کی حرمت

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

''ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض و لا یصلحون ''(شعراء/۱۵۱۔۱۵۲)

مسرفوں کی پیروی مت کرو جو زمین پر فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

'' فاصبر لحکم ربک ولا تطع منھم آثما او کفورا ''
(انسان/۲۴)

اپنے رب کے حکم کے سامنے صبر کرو اور ان میں سے گنہگار اور ناشکرے کی پیروی نہ کرو۔

بلا شبہ یہ حکام مسرفوں، مفسدوں اور گنہگاروں میں سے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان سے متعلق خدا کا حکم یہی ہے کہ ان کی اطاعت سے اجتناب کیا جائے، ان کے سامنے تسلم ہونا اور ان کا حکم ماننا حرام ہے اور ان سے انکار کرنا اور جامعہ میں ان کی سرداری اور اقتدار وحاکمیت کو ٹھکرانا واجب ہے۔

۱۔ تاریخ الرسل والملوک، ج/۴ص/۳۰۰۔ کافی، ج/۳ص/۲۸۰، حوار فی التسامح والعنف، ص/۶۶۔۶۷

نتیجہ

ان دونوں مقدموں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی حکومت کی تشکیل اور مسلمانوں کے درمیان عادل امام کا منصوب ہونا ایک ضرورت ہے تا کہ خداوند عالم کا حکم نافذ کرے اور معاشرہ کے امور کو الٰہی حدود، شرعی احکام، اجتماعی ،اقتصادی، سیاسی اور امن وامان کی بنیاد پر مرتب کرے جو کہ اسلامی حکومت کی تشکیل پر ہی موقوف ہے۔

تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہر سماج میں حکومت کی تشکیل ایک یقینی اور حتمی ضرورت ہے، چاہے اسلامی حکومت ہو چاہے ظالم اور منحرف حکومت ہو اور چوں کہ مسلمانوں کا وظیفہ ظالم ومنحرف حکومت سے مقابلہ کرنا اور اس کی نفی کرنا ہے لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان ضروریات کو صحیح وسالم طریقہ سے پورا کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی تشکیل میں لگ جائیں۔

۴۔اجماع

فقہا، ومتکلمین نے فقہ وکلام میں اس اجماع سے متعلق مکرر طور پر تصریح کی ہے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کو ایک اجماعی امر قرار دیا ہے، شیخ طوسیؒ کتاب ''تلخیص الشافی'' میں لکھتے ہیں:

> '' امامت کے وجوب پر لوگوں میں دو طرح کا اختلاف ہے: جمہور کی اکثریت اور زیادہ تر مسلمانوں کا کہنا ہے کہ: امامت واجب ہے، بہت ہی کم افراد کا کہنا ہے کہ: امامت واجب نہیں ہے یہ، افراد مشہور جماعت کے نہیں ہیں بلکہ کچھ پست افراد ہیں جو معروف نہیں ہیں وجوب امامت کا عقیدہ رکھنے والوں کی بھی دو قسم ہے، شیعہ اور معتزلہ کی اکثریت کا کہنا ہے کہ: وجوب امامت کی دلیل عقل ہے اور نقل (روایت) پر موقوف نہیں ہے، باقی تمام معتزلہ کا کہنا ہے کہ: امامت واجب نقلی (روائی) ہے۔[۱]

ماوردی کتاب ''احکام السلطانیہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''علماء کے اجماع کے مطابق امامت کا امت کے درمیان اس منصب کے ذمہ دار کے ساتھ منعقد ہونا واجب ہے اگر چہ ''اصم'' کی یہ رائے نہیں ہے ۔۔۔ امامت کے وجوب سے متعلق اختلاف ہے کہ آیا واجب عقلی ہے یا واجب شرعی ہے؟ ایک گروہ کا

۱۔ تلخیص الشافی، ج ۱/ص ۵۵۔۵۸

کہنا ہے کہ واجب عقلی ہے اس لئے کہ عقل یہ حکم دیتی ہے کہ انسان لوگوں کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم سے منع کرنے والے اوران کے درمیان فیصلہ کرنے والے رہبر کی اطاعت و پیروی کرے اوراس کے سامنے تسلیم ہو۔اگر یہ والی وسرپرست نہ ہوں گے تو لوگ کسی سرپرست اور ذمہ دار کے بغیر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ۔امامت واجب شرعی ہے نہ کہ عقلی ، اس لئے کہ امام شرعی امور کا ذمہ دار ہوتا ہے۔[1]

قرطبی کے بقول:

''امام و حاکم کے منصوب ہونے کے وجوب پر امت اور رہبروں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے سوائے ''اصم'' سے منقول کلام کے کہ وہ اوراس کے چاہنے والے اسے واجب شرعی سمجھتے تھے ان کا کہنا ہے :امامت دین میں واجب نہیں ہے بلکہ دین امامت کو جائز اور مباح سمجھتا ہے اور اگر امت اپنا حج انجام دے، دشمنان دین سے جہاد کرے اور ایک دوسرے سے متعلقات میں انصاف سے کام لے۔۔۔تو یہی کافی ہے اس (امت) پر واجب نہیں ہے کہ کوئی امام منصوب کرے جوان کاموں کی سرپرستی کرے ''[2]

سید شریف جرجانی امام کے منصوب ہونے کے وجوب پر امت کے اجماع کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اگر چہ صحابہ کے درمیان امامت کے منصب کو سنبھالنے والے شخص کو معین کرنے میں اختلاف تھا لیکن امام کے منصوب ہونے کے وجوب پر آپس میں کوئی اختلاف نہیں تھا کہ وہ امام لوگوں کے درمیان حکومت کرے۔[3]

شہرستانی کہتے ہیں:

۲۔الاحکام السلطانیہ،ص/۵

۳۔الجامع الاحکام القرآن، ج/۱،ص/۲۶۴

۴۔شرح المواقف، ج/۸،ص/۳۴۵

''جب ابوبکر کے مرنے کا وقت قریب ہوا تو لوگوں نے کہا: امامت و رہبری کے لئے شوریٰ (مشورہ) کریں۔ تو انھوں (ابوبکر) نے عمر کے اوصاف شمار کئے اور ان کی بیعت کروائی۔۔۔ نہ ان ہی کا دل مانا اور نہ ہی کسی اور کے دل میں آیا کہ زمین امام سے خالی رہے۔۔۔ یہ دلیل ہے کہ صحابہ جو صدر اول کے مسلمان تھے سب کا متفقہ نظریہ تھا کہ ہر حال میں کوئی نہ کوئی امام ہونا چاہئے۔۔۔ اور یہ اجماع وجوب امامت کی قطعی اور یقینی دلیل ہے۔[1]

ابن خلدون لکھتے ہیں:

''امام کا منصوب ہونا واجب ہے جیسا کہ اس (نصب امام) کا وجوب شریعت میں صحابہ و تابعین کے ذریعہ معلوم ہوا ہے، اس لئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب آپؐ کی رحلت کے وقت، ابوبکر کی بیعت کے لئے آگے بڑھے اور اپنے امور میں ان ہی کی رائے کے سامنے تسلیم ہوئے، اسی طرح ہر زمانے میں یہی معمول تھا اور لوگ کسی دن بھی اپنی حالت زار پر چھوڑے نہیں گئے اس امر کا استقرار ہر زمانے مین اجماع کی منزل پر رہا ہے جو امام کے منصوب ہونے کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ [2]

تفتازانی نے گزشتہ اجماع کا اقرار کیا ہے اور سوائے ''نجدات'' جو خوارج کا ایک گروہ ہے جو نجدہ بن عویمر کے پیرو ہیں، کے کسی اور اسلامی جماعت کو اس اجماع سے خارج نہیں کیا ہے۔ [3]

سمجھ میں یہی آرہا ہے کہ معتزلہ سے ''اصم'' اور خوارج سے ''نجدات'' کو مستثنیٰ کرنا دقت سے خالی ہے ،عبدالجبار بن احمد معتزلی کتاب ''المغنی'' میں اصم سے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے استاد جبائی نے اصم سے حکایت نقل کی ہے کہ:

۱۔نہایۃ الاقدام،ص/۴۷۹

۱۔مقدمہ، ج/۱،ص/۳۶۶.

۲۔شرح المقاصد، ج/۲،ص/۲۷۳.

''اگر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ آپس انصاف سے کام لیں اور ایک دوسرے پر ظلم و حد جاری کرنے کے اسباب ختم ہو جائیں تو لوگوں کو امام کی ضرورت ہی نہ ہوگی پھر کہتے ہیں: لوگوں کے حالات سے پتہ یہی چلتا ہے کہ حالات اس کے برعکس ہیں لہٰذا ان کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا قیام واجب ہے۔'' [1]

خوارج کا ابتدا میں یہی نظریہ تھا لیکن بعد میں پلٹ گئے اور عبداللہ بن وہب راسبی کو اپنی امارت (حکمرانی) کے لئے منتخب کیا۔

ہم اس اجماع کی توضیح میں یہی کہیں گے کہ: اس اجماع کا متعلق اور مورد یہ ہے ایک لائق شخص امامت کے منصب پر فائز ہو جو مسلمانوں کے درمیان حکومت کرے، مسلمان خلافت و رہبری کے مستحق کے شرائط سے متعلق اختلاف نظر رکھتے ہیں، بعض مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ امامت نص کے ذریعہ معین ہوتی ہے، بعض کا نظریہ یہ ہے کہ امامت کے مستحق اور لائق امامت کی عام شرطیں یہ ہیں یعنی: عدالت، فقاہت، کفایت اور تجیز شرط انتخاب ہے .اس کے باوجود، دونوں گروہ امام کے منصوب ہونے کے وجوب پر متفقہ نظریہ رکھتے ہیں.

فطری طور سے اس اجماع میں جہاں پر سارے لوگ متفق ہیں وہ یہ ہے کہ امامت کے لائق انسان کے ہاتھ میں حکومت اور سروری ہو... یہاں تک سارے مسلمان متفقہ نظریہ رکھتے ہیں سوائے بہت ہی کم افراد کے، جیسے: ''نجدات'' و ''اصم'' جن کے سارے مسلمانوں کے نظریہ سے اختلاف میں بھی شک وشبہ پایا جاتا ہے۔

۱۔ المغنی، ص/۲۸، بہ نقل از: رئاسۃ الدولہ، ص/۶۲.

فتنوں کو سرکوب کرنے میں نبیؐ کا طرز عمل

لبنان کے ایک اہل سنت عالم کی ایک اچھی تحریر

ڈاکٹر اسعد السحمرانی (۞)

ترجمہ: کرار حسین اظہری

خلاصہ:

فتنہ انگیزی، تفرقہ اندازی اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنا یہ ساری چیزیں مختلف صورتوں میں جیسے جدید مشرق وسطیٰ، اقلیتوں کی آزادی اور دینی آزادی وغیرہ دشمن کے بڑے بڑے مقاصد ہیں لہٰذا دین کے تمام بزرگوں کا فریضہ ہے کہ ان فتنوں کا دفاع کریں اور اتحاد و اتفاق کی طرف سارے مسلمانوں کی ہدایت کریں۔ مقالہ نگار نے اس مضمون میں قرآنی آیات اور نبوی سیرت سے استناد کرتے ہوئے فتنوں کی تمام جڑوں کی تحقیق کی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ انھیں سرکوب کرنے کے لئے نبوی طریقہ کیا ہے آپ نے صدر اسلام کے عینی نمونوں کو پیش کرتے ہوئے دنیا کے تمام مسلمانوں کو ہر قسم کے تفرقہ و انتشار سے پرہیز کرنے اور زمانہ کے تمام شیطانوں سے ہوشیار رہنے کی دعوت دی ہے۔

کلیدی الفاظ:

فتنہ انگیزی، تفرقہ اندازی، آئین نبوی، اتحاد، اسلامی اتحاد، ہوشیاری، صہیونیزم۔

۞۔ بیروت میں ''الامام الاوزاعی'' یونیورسٹی کے عقائد و ادیان کے استاد، لبنان کی عوامی انجمن میں دینی امور کے ذمہ دار

مقدمہ

یہ بحث یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ عربی واسلامی امت کن حالات وحادثات سے دوچار ہے اوراس کے دشمن افراد اس امت کے جیالوں کی طاقت اور اتحاد کو نقصان پہنچانے میں فتنہ انگیزی، تفرقہ اندازی اور اختلاف پیدا کرنے میں کیا کیا سازشیں کررہے ہیں، دین اور معاشرہ کے غیرت مند افراد پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ استعماری طاقتیں اور امریکی صہیونیستی سازشیں ''عالمی حکمرانی''، ''جدید مشرق وسطیٰ'' یا ''عظیم مشرق وسطیٰ'' ''اقلیتوں کی آزادی'' اور ''دینی آزادی'' وغیرہ وغیرہ جیسے عناوین سے میدان عمل میں ہیں لیکن ان تمام عناوین کا صرف ایک ہی مقصد ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کو متفرق کردیں اور ان کی سرزمینوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیں۔ انھیں مذہبی ونسلی اور فرقہ وارانہ شعبوں میں تبدیل کردیں تاکہ آسانی سے انھیں اپنے قبضہ میں لئے رہیں اور انھیں اپنے اشاروں پر نچاتے رہیں۔

اس مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ فتنوں کا مقابلہ کرنے اور انھیں دبانے کے سلسلہ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا طریقہ تھا اور آج کل بھی ہمیں ان اصول وقوانین کی سخت ضرورت ہے۔

فتنہ، شر ہے اور اتحاد، رحمت ہے۔

خداوند عالم نے مومنین کو اتحاد، برادری اور ہم دلی کا حکم دیا ہے کیوں کہ یہ مفاہیم ایک ایسی رحمت ہیں جن سے معاشرہ کی حفاظت ہوتی ہے اور ارتباط کو قوت ملتی ہے اس کے ثبات واستقرار کو تحقق حاصل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ خداوند عالم نے بھی معاشرہ کے تمام لوگوں کو فتنہ سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے اور فتنہ کے تمام خطروں اور برائیوں کو بیان کیا ہے۔

قرآنی آیات میں فتنہ کی مذمت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا شر بالکل عام ہوتا ہے چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿والفتنة اکبر من القتل﴾

''فتنہ وآشوب، قتل سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے'' (بقرہ/۲۱۷)

دوسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿و اتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة و اعلموا ان الله شديد العقاب﴾

''تم سب لوگ ایسے فتنہ سے ڈرو کہ جب وہ پھیل جائے گا تو تم میں سے صرف انھیں لوگوں تک نہیں پہنچے

گا جو ظلم کر چکے ہیں (بلکہ وہ سب کے دامنگیر ہو جائے گا) اور یہ جان لو کہ خدا بڑی سختی سے سزا دینے والا ہے۔ (انفال/۲۵)

لغوی اعتبار سے کتاب ''لسان العرب'' میں فتنہ کے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں: کچھ ایسی چیزیں جن کے ذریعہ امتحان ہوتا ہے اور پرکھا جاتا ہے دراصل یہ فتن الفضۃ اوالذھب سے ماخوذ ہے یعنی چاندی یا سونے کو اس لئے پگھلانا کہ اس کا خالص حصہ غیر خالص حصہ سے الگ ہو جائے۔ کتاب ''الصحاح'' میں یہ تعریف کی گئی ہے سونے چاندی کو آگ میں ڈالنا تا کہ اس کی حالت واصلیت کا پتہ چل سکے اور ''فتن'' کے معنی جلانے کے ہیں، طلا کار یا نقرہ کار کو ''فتان'' کہتے ہیں اسی طرح شیطان کو بھی ''فتان'' (فتنہ انگیز) کہتے ہیں اور اسی لحاظ سے کالے پتھر کو ''الفتین'' کہتے ہیں گویا آگ نے اسے جلا کر کالا کر دیا ہے۔۔۔

''ابن اعرابی'' کہتے ہیں کہ ''فتنہ'' کے یہ سارے معانی ہیں: امتحان، محنت ورنج، مال وجائیداد، اولاد، کفر ،لوگوں کا نظریاتی اختلاف اور آگ میں جلانا نیز یہ کہا گیا ہے کہ اصطلاح میں فتنہ کے معنی ظلم وستم کے ہیں۔ (ابن منظور، ج/۱۳، ص/۳۱۶)

اتحاد سے اپنے اندر طاقت پیدا ہوتی ہے اور اتحاد سے اپنے دین، اپنی سرزمین، مقدسات اور حقوق و کرامت کی حمایت ہوتی ہے جب کہ اختلاف وتفرقہ سے پورا معاشرہ فتنہ کی طرف جاتا ہے اور عزت وقدرت ختم ہو جاتی ہے پھر ذلت و بے اعتباری اور بے ہودگی پیدا ہو جاتی ہے تمام لوگ اس امتحان میں ہیں لیکن اس میں کامیاب صرف وہی لوگ ہیں جن کا ایمان پختہ اور یقین محکم ہے اور جن کے دل ودماغ پر شیطان غالب ہے وہ لوگ شر اور فتنہ کی آگ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس کے شعلے ہر طرف بھڑکنے لگتے ہیں وہ تمام لوگوں کو جلا دیتے ہیں۔

آئین نبوی میں فتنہ اور اس کی ریشہ کنی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ ہمیں فتنوں سے بچنے کی تاکید کی ہے کیوں کہ فتنہ کی وجہ سے معاشرہ سے اتحاد، ثبات، ہمدلی اور آپسی محبت و دوستی ختم ہو جاتی ہے درحقیقت یہ قتل اور اسلحے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

فتنہ کی مذمت اور اس سے بچنے کے سلسلہ میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے بعض روایات مندرجہ ذیل ہیں:

''دیکھو فتنوں سے دور رہنا کیوں کہ اس میں زبان، تلوار کا اثر رکھتی ہے''۔(اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے)''ابوداؤد نے بھی اس حدیث کے متن کو نقل کیا ہے:'' فتنے بہرے گونگے اور اندھے ہوتے ہیں ان میں زبان، تلوار کا اثر رکھتی ہے'' نیز ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے::''فتنہ تمام اعراب کو گھیر لے گا اس میں مرنے والے تمام لوگ دوزخ میں جائیں گے اس میں زبان، تلوار سے بھی زیادہ موثر اور تیز ہے''۔

فتنوں کے بارے میں یہ ساری سفارشیں اور تاکیدیں اس لئے ہیں کہ ہمیں بیدار کر دیا گیا ہے کہ فتنوں کے خطرات اور ان کے اثرات پورے معاشرے اور تمام افراد پر پڑتے ہیں حدیث میں جو یہ بیان کیا گیا کہ فتنہ بہرا، گونگا اور اندھا ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تاریکی اور نادانی و جہالت موجود ہوتی ہے کیوں کہ فتنہ میں کبھی بھی آگاہی و عقلمندی نہیں ہوتی اور فتنہ کے خطرات معاشرہ کے تمام افراد کو گھیر لیتے ہیں پھر سب کی ہلاکت و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔

حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو طریقہ اختیار فرمایا اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فتنوں کے بارے میں کیا کرنا چاہئے اس مقالہ میں ہم دو ایسے حادثے بیان کر رہے ہیں جو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رونما ہوئے تھے ان سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اہل ایمان کے درمیان کس طرح فتنہ پھیلایا جاتا ہے اور اس کے اسباب وعوامل کیا ہوتے ہیں چنانچہ ایک فتنہ میں معاشرہ کے باہر سے ایک دشمن کا ہاتھ ہے اور دوسرے معاشرہ کے اندر سے ایک منافق کا ہاتھ ہے۔

پہلا واقعہ ایک خارجی دشمن ''شاس بن قیس یہودی'' سے متعلق ہے یہ مدینہ کا رہنے والا ایک یہودی تھا اس نے ''اوس'' اور ''خزرج'' مدینہ کے ان دو اہم قبیلوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی جب اس نے یہ دیکھا کہ خداوند عالم نے ان دونوں قبیلوں کے تمام افراد کے دلوں کو ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے اور وہ لوگ نعمت وفضل الٰہی کے ذریعہ ایک دوسرے سے قریب اور آپس میں بھائی بھائی ہو گئے ہیں۔ واقعہ یہ تھا ''شاس بن قیس'' جو یہودیوں کا عالم تھا اس نے اپنے نائب کو ان دونوں قبیلوں کے پاس بھیجا اور ان لوگوں کے اسلام لانے سے پہلے ان کے درمیان جو دشمنی وخون ریزی اور جاہلیت کا تعصب تھا ان سب باتوں کو انھیں یاد دلایا چنانچہ اس روایت کے مطابق جو ''مکرمہ''، ''ابن زین'' اور ''ابن عباس'' سے مروی ہے اس میں وارد ہے کہ ''شاس بن قیس یہودی'' نے پوشیدہ طور پر ایک شخص کو بھیجا کہ اوس وخزرج کے درمیان جا کر ان میں پہلے آپس میں جو جنگیں اکثر

۱۔اس موضوع پر جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ سب کتاب ''مجموعۃ الحدیث النجدیہ، المدینۃ المورۃ، طبع سوم ۱۳۸۳ھ.ق میں جمع کی گئی ہیں۔

ہوتی تھیں انھیں یاد دلائے لیکن ہوا یہ کہ حضرت رسول اکرمؐ ان کے درمیان تشریف لے گئے اور اس سازش کا راز فاش کر دیا وہ لوگ بھی سمجھ گئے کہ یہ ایک شیطانی کام تھا اور اس میں دشمنوں کی سازش تھی۔ پس ان لوگوں نے اپنے اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دیئے اور گریہ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے گلے ملے اور حضرت رسول اکرمؐ کی مکمل طور سے اطاعت کرتے ہوئے آپؐ کے ساتھ چل پڑے اس وقت قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اتو الکتاب یردو کم بعد ایمانکم کافرین﴾

''اے اہل ایمان! اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرو گے جنھیں کتاب دی گئی ہے تو وہ لوگ تمھیں ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے۔'' (آل عمران/۱۰۰)

''شاس بن قیس'' ان لوگوں میں سے تھا جن کے اندر قوم پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ان لوگوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم خدا کی ایک منتخب قوم ہیں اسی دلیل کی بناء پر وہ لوگ ہمیشہ جنگ اور قتل میں مشغول رہنا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ جب کسی معاشرہ کو پائدار پاتے ہیں لوگوں میں امن و آسائش دیکھتے ہیں تو انھیں غصہ آجاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کا آج کل دنیا کی تمام قومیں مشاہدہ کر رہی ہیں اور امریکہ کے صہیونیستی رہبر واشنگٹن میں بیٹھ کر فتنہ برپا کرنے کے لئے قوموں کے اندر طرح طرح کے فرقہ وارانہ، مذہبی و سیاسی فساد کا پروگرام بناتے ہیں کیوں کہ وہ لوگ اپنی کامیابی اور خوشی اسی میں دیکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ جنگ میں مشغول رہیں اور برابر خون ریزی کا سلسلہ جاری رہے۔ اس سے یہ بات یاد آتی ہے کہ کس طرح ''شاس بن قیس'' کی شخصیت اکثر ایسے لوگوں میں حلول کر گئی ہے جو امریکی صہیونیستی سازشوں میں شریک ہیں اور ان کے فتنے موجودہ حادثات تک پھیلے ہوئے ہیں جو مختلف علاقوں میں رونما ہو رہے ہیں۔

ان فتنوں کا مقابلہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ایمان کے ساتھ کوئی تعصب نہ ہو اور وہ ایمان ایسا ہو جو تمام شر کو روک سکے، دین میں جو تساہل، تسامح اور عطوفت و عشق موجود ہے یہ فتنوں کو دبانے اور فتنہ پرست لوگوں سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں ایک موثر علاج ہے اور اس سے ایسی فضیلت ظاہر ہوسکتی ہے جس سے فساد برپا کرنے والوں کی ساری سازشیں ناکام ہوسکتی ہیں. خداوند عالم یہودیوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿کلما اوقدوا نارا للحرب اطفأ ھا اللہ و یسعون فی الارض فسادا واللہ لایحب المفسدین﴾ ''ان لوگوں نے جب بھی جنگ کی آگ بھڑکائی خدا نے اسے خاموش کر دیا اور وہ لوگ روئے زمین پر فساد و بربادی کی کوشش کرتے رہتے

ہیں اور خدا فساد برپا کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔'' (مائدہ/۶۴)

جنگ اور خون ریزی برپا کرنا ہمیشہ سے اس سرکش گروہ کا شیوہ رہا ہے اور ہم آج بھی یہی مشاہدہ کر رہے ہیں۔ جب حضرت رسول اکرمؐ نے اس زمانہ میں بڑی تیزی کے ساتھ اختلاف کو ختم کرنے اور فتنہ کو دبانے کے لئے تمام لوگوں پر زور دیا تو آج بھی امت کے تمام علماء اور اہل نظر کا فریضہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے عمل کو اپنے لئے نمونہ قرار دیں اور تمام لوگ مسلمانوں کے درمیان روح برادری کو زندہ کریں اور کسی ایک کو اپنا رہبر بنا کر امریکی صہیونیستوں شدت پسندوں اور تعصب کی روش پر عمل کرنے والوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں یہ لوگ برابر فتنے برپا کرتے رہتے ہیں ہر وقت تعصب اور فرقہ پرستی کی باتیں کرتے رہتے ہیں کیوں کہ اتحاد ہر شہر و دیار کا ایک شرعی مقصد ،اسلامی بنیاد اور دینی وملی ضرورت ہے۔

طبری اپنی تفسیر میں اس اتفاق واتحاد کے بارے میں کہتے ہیں:

''اوس اور خزرج انصار کے دو اہم قبیلے تھے جن کے درمیان دور جاہلیت میں کینہ کے ساتھ جنگ ،دشمنی اور خون ریزی ہوا کرتی تھے خدا نے ان کے اوپر احسان کر کے حضرت رسول اکرمؐ جیسا عظیم الشان پیغمبرؐ بھیجا جس نے ان کے درمیان جنگ کے بھڑکتے شعلوں کو خاموش کر دیا دین اسلام کے ذریعہ ان میں دوستی و برادری برقرار کر دی۔ وہ مزید کہتے ہیں: ایک مرتبہ ایک شخص اوس قبیلہ کا تھا اور دوسرا خزرج کا دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے اس وقت ان کے پاس ایک یہودی بھی بیٹھا ہوا تھا وہ برابر انھیں پرانی جنگ و دشمنی اور آپسی اختلاف کو یاد دلا رہا تھا وہ دونوں اس کی باتیں سنتے سنتے بھڑک گئے پھر دونوں نے اپنی اپنی قوم کو بلایا وہ لوگ بھی ہتھیار لے کر نکل پڑے اور ایک دوسرے سے مقابلہ کے لئے آمنے سامنے آ گئے۔ اس کے بعد طبری لکھتے ہیں: اس دن حضرت رسول اکرمؐ مدینہ میں تشریف فرما تھے ان کے پاس گئے انھیں سمجھا بجھا کر روکا وہ لوگ اپنے اپنے قبیلوں کی طرف لوٹ گئے اور ہتھیار اتار دیئے۔'' (طبری، ۱۴۱۵، ص/۳۵)

کیا اس امت کے غیرت مند علماء کسی ایسے مشن کا آغاز کر سکتے ہیں؟ کیوں کہ اسلام کی بنیاد تو ''عقیدۂ توحید اور اتحاد کلمہ'' کے قاعدہ پر مبتنی ہے کیا دین کی طرف دعوت دینے والے اور امت کے رہبر افراد اس گروہ اور اس گروہ کے درمیان جاتے ہیں تا کہ امریکی صہیونیستی سازشوں کو کامیاب ہونے سے روک دیں؟

دوسرا واقعہ جس کی وجہ سے فتنہ ہوتے ہوتے بچ گیا وہ ''عبداللہ بن ابی بن سلول'' منافق کی طرف سے کھڑا ہوا تھا یہ ماہ شعبان میں ہجرت کے پانچویں یا چھٹے سال میں غزوۂ بنی مصطلق کے دوران کا ہے اس واقعہ کی تفصیل ہم طبری کی روایت کے مطابق نقل کر رہے ہیں: ''حضرت رسول اکرمؐ کو یہ خبر دی گئی کہ ''خاندان مصطلق'' آپ کے خلاف سازش کر رہا ہے [ان میں حارث بن ضرار وغیرہ جیسے افراد تھے] جب حضورؐ کو یہ پتا چل گیا تو ان کی طرف گئے ''قدید'' (مکہ کے قریب ایک جگہ کا نام) میں ساحل کے کنارے ''المریسیع'' نام کے کنویں کے پاس ان لوگوں کا سامنا ہوا دونوں طرف کے لوگ آپس میں بھڑ گئے سخت جنگ شروع ہوئی خدا نے بنی مصطلق کو شکست دی اور ان کے بہت سے لوگ مار ڈالے گئے...۔

جس وقت لوگ کنویں کے پاس تھے کچھ دوسرے لوگ بھی عمر بن خطاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے ''غفار'' خاندان کا ایک شخص جس کا نام ''جہجاہ بن سعید'' تھا وہ عمر بن خطاب کی لگام کو سنبھالے ہوئے تھا ''جہجاۃ'' اور ''سنان الجہنی'' جو ''بنی عوف بن خزرج'' کے ہم پیمان تھے یہ لوگ کنویں کے پاس پہنچے پانی بھرنے کے لئے آپس میں اختلاف کرنے لگے جہنی نے فریاد بلند کی: اے گروہ انصار! میری مدد کرو! جہجاہ نے بھی فریاد بلند کی: اے گروہ مہاجر! میری مدد کرو! عبداللہ بن ابی بن سلول کو غصہ آیا اس کے کچھ رشتے دار ساتھ میں تھے انھیں کے درمیان ''زید بن ارقم'' نوجوان بھی تھا عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: آخر کار ان لوگوں نے اپنا کام کر لیا ہم لوگوں سے بدظن ہو گئے اور ہماری سرزمین میں ان کی تعداد ہم سے زیادہ ہو گئی سچ کہا گیا ہے ''سگت را فربہ کنی تو را می خورد: اپنے کتے کو کھلا کر موٹا کرو گے تو تم ہی کو کھا جائے گا'' خدا کی قسم جب ہم لوٹ کر مدینہ جائیں گے تو عزیز ترین افراد ذلیل ترین افراد کو نکال باہر کر دیں گے (ہم سب کو دیکھ لیں گے)۔

پھر اپنی قوم کی طرف رخ کر کے کہا: یہ وہ کام تھا جسے تم لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیا ہے، اپنی سرزمین کو ان کے اختیار میں دے دیا ہے اور اپنے مال کو ان کے ساتھ تقسیم کر دیا ہے خدا کی قسم جو کچھ ان کے اختیار میں ہے اگر تم اسے لے لو گے تو یہ لوگ دوسری سرزمینوں کی طرف چلے جائیں گے، زید بن ارقم جیسے نوجوان نے ان باتوں کو سنا اور فوراً حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دے دی آپؐ ابھی تازہ تازہ دشمن سے فارغ ہوئے تھے آپ نے واقعہ اور تمام گفتگو کو سنا، عمر بن خطابؓ بھی وہاں موجود تھے انھوں نے کہا: آپ ''عباد بن بشر بن

وقش'' کو حکم دیں کہ اسے قتل کر دیں۔حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: عمر! بھلا میں کیسے ایسا کام کر سکتا ہوں؟ کیا لوگ یہ نہیں کہنے لگیں گے کہ محمدؐ اپنے اصحاب کو قتل کر رہے ہیں؟ میں ایسا نہیں کر سکتا ہاں! کوچ کرنے کا اعلان کر دو۔ وہ بھی ایسے وقت کہ جناب رسول خداؐ عام طور سے اس وقت سفر نہیں کرتے تھے۔لوگ چلے گئے جب عبداللہ بن ابی بن سلول نے سنا کہ زید بن ارقم نے یہ باتیں رسول اکرمؐ سے بیان کر دی ہیں تو آپؐ کی خدمت میں آیا اور خدا کی قسم کھا کر کہا کہ جو کچھ زید بن ارقم نے بیان کیا ہے اس نے وہ باتیں نہیں کہی ہیں قطعاً وہ اپنی زبان پر یہ باتیں نہیں لایا ہے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی قوم کے درمیان ایک بزرگ اور شریف انسان کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کا احترام کیا جاتا تھا حضرت رسول اکرمؐ کے ایک انصاری صحابی جو وہاں موجود تھے عبداللہ بن ابی کا دفاع کرتے ہوئے انھوں نے آپؐ سے عرض کیا: اے خدا کے رسول! ممکن ہے کہ یہ جوان (زید بن ارقم) غلطی کر گیا ہو اور اپنی باتوں کو اچھی طرح بیان نہ کر سکا ہو۔

جب حضرت رسول اکرمؐ وہاں سے ہٹے تو ''اسید بن حضیر'' نے آپ سے ملاقات کی درود بھیج کر عرض کیا: ''اے رسول خداؐ آپ نے ایسے میں وقت کوچ کیا ہے کہ عام طور سے کوچ نہیں کرتے تھے۔رسول اکرمؐ نے فرمایا: تمھارے دوست نے جو کچھ کہا تم نے سنا نہیں؟ عرض کیا: اے خدا کے رسولؐ! کون دوست؟ فرمایا: عبداللہ بن ابی بن سلول عرض کیا: اس نے کیا کہا ہے؟ فرمایا: اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جب مدینہ واپس ہوں گے تو سب سے زیادہ عزیز لوگ سب سے زیادہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کر دیں گے۔اسید نے کہا: خدا کی قسم اے اللہ کے رسولؐ! وہ آپؐ ہی ہیں کہ اگر چاہیں گے تو اسے نکال باہر کر دیں گے اور خدا کی قسم سب سے زیادہ ذلیل وہی ہے اور سب سے زیادہ عزیز آپؐ ہیں۔اس کے بعد مزید کہا: اے خدا کے رسولؐ! اس پر رحم فرمائیں اس خدا کے واسطہ جس نے آپ کو مبعوث بہ رسالت کیا ہے، اس کی قوم کے لوگ اس کا بڑا احترام کرتے ہیں، اس کی اطاعت کرتے ہیں اور وہ اس پر برہم ہے کہ آپؐ نے اس کی ملکیت وقدرت کو سلب کر رکھا ہے''۔(طبری، ج ۲/۱۴۲۲ھ، ص ۱۰۹/)

''عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول'' مشہور منافق کا بیٹا اس واقعہ میں موجود تھا اس نے حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں شرفیاب ہو کر عرض کیا: ''اے خدا کے رسولؐ! میں نے سنا ہے کہ آپؐ میرے باپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں اگر واقعاً آپ کا یہی ارادہ ہے تو آپ مجھے حکم دیں میں اس کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں پیش

کردوں مجھے اس بات کا خطرہ ہے کہ آپ کسی دوسرے شخص کو اسے قتل کرنے کا حکم دے دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ جب میں اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں کے درمیان چلتا ہوا دیکھوں تو اسے قتل کردوں پھر اس طرح سے ایک کافر کے بدلے میں ایک مومن کو قتل کردوں اور جہنمی بن جاؤں۔

حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: (نہ صرف یہ کہ میں اسے قتل نہیں کروں گا) بلکہ وہ جب تک ہمارے ساتھ رہے گا ہم اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے رہیں گے اور اس کا احترام بھی کرتے رہیں گے۔ اس کے بعد جب بھی وہ (اس طرح کا) کوئی کام انجام دیتا تھا اس کی قوم مذمت کرتی تھی اور اس پر اعتراض کرتی تھی۔ جس وقت حضرت رسول اکرمؐ کو یہ معلوم ہوا کہ اس کی قوم کا رویہ بدل گیا ہے تو عمر بن خطاب سے فرمایا: عمر! اس وقت تم کیا کہہ رہے تھے؟ خدا کی قسم جس دن تم کہہ رہے تھے اگر میں اسی دن سے قتل کر دیتا تو بہت سے لوگوں کو بڑا گراں گزرتا لیکن اگر آج میں ایسا کروں تو کوئی بات نہیں ہوگی۔ عمر نے کہا: جناب رسول خداؐ کا حکم میرے حکم سے زیادہ با برکت ہے''۔ (ابن اثیر، ۱۴۱۵، ص/۱۹۴).

اس واقعہ سے متعلق سورۂ منافقون میں یہ آیت نازل ہوئی ہے:

﴿ اذا جائک المنافقون قالوا نشهد انک لرسول الله والله یعلم انک لرسوله والله یشهد ان المنافقین لکاذبون ﴾

''پیغمبرؐ! جب تمھارے پاس منافقین آتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں ہم یہ گواہی دے رہے ہیں کہ بیشک آپ خدا کے رسول ہیں اور خدا تو جانتا ہی ہے کہ آپ اس کے رسولؐ ہیں اور خدا یہ گواہی دے رہا ہے کہ منافقین بڑے جھوٹے ہیں''

(منافقون/۱)۔

خداوند عالم پھر اسی سورہ میں ارشاد فرما رہا ہے:

﴿ یقولون لئن رجعنا الی المدینة لیخرجن الاعز منها الاذل و لله العزة و لرسوله وللمومنین و لکن المنافقین لا یعلمون ﴾

وہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ جب ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں گے تو عزیز ترین لوگ ذلیل

لوگوں کو وہاں سے باہر نکال دیں گے اور عزت وقوت صرف خدا اس کے رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے لیکن منافقین نہیں جانتے ہیں۔(منافقون/۸).

''غزوۂ بنی مصطلق'' اور جو باتیں اس کے بعد واقع ہوئیں ان میں بہت سی عبرتیں اور بہت سے ظریف نکات پوشیدہ ہیں یہاں پر ان میں سے بعض نکات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱۔ یہ غزوہ اس وقت واقع ہوا جب لوگ ''مریسیع'' کنویں کے پاس جمع تھے بنابرایں صحرائی علاقوں میں پانی (کنواں) بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے پھر ''بنی مصطلق'' کی شکست کے بعد وہ اتفاقات رونما ہوئے کیوں کہ لوگ پانی لینے کے لئے کنویں پر جمع ہو گئے تھے اور یہ جنگ و ماومت کے سلسلہ میں ایک بہت اہم درس ہے ہماری نظر ہمیشہ اقتصاد پر رہنی چاہئے اور ہمیں ہمیشہ اس فکر میں رہنا چاہئے کہ مناسب وسائل اور طریقہ کے ذریعہ دشمن کے اقتصادی منابع کو محدود کریں آج کل اس کی تدبیر یہ ہے کہ دشمنوں کی تیار کی ہوئی تمام چیزوں کو حرام قرار دے دیا جائے اور ان کا اقتصادی محاصرہ کیا جائے کیوں کہ اقتصاد کمزور ہونے کی وجہ سے سارے امکانات کمزور ہو جاتے ہیں اور انھیں میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ دشمن کی فوجی توانائی وامکانات بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔

جس وقت حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کی قوم سے جہاد کرنے کے سلسلہ میں خدا کی تائید ونصرت طلب کی تھی تو قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی زبان سے یہ بیان ہوا ہے:

''ربنا اطمس علی اموالهم ...''

''خدایا! ان کی ساری چیزوں کو نیست ونابود کردے...'' (یونس/۸۸).

۲۔ تعصب بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے یہ ایسی سخت راہ ہے جس سے اسلام نے ہم کو منع کیا ہے واقعاً تعصب باعث بنتا ہے کہ انسان اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ظلم میں شریک ہوتا ہے، تعصب اور فرقہ پرستی ایسے فتنوں کا سرچشمہ ہے جس سے ساری چیزیں درمیان سے اٹھ جاتی ہیں جب بھی تعصب کی آگ بھڑکتی ہے تو یقینی طور پر جنگ اور اختلاف شروع ہو جاتا ہے اور یہ بات غزوۂ بنی مصطلق کے حوادث کو پیش نظر رکھتے ہوئے مکمل طور سے واضح ہے۔ جب اس جنگ کے شروع میں دونوں حریفوں یعنی ''جہجاہ بن غفاری'' اور ''سنان الجہنی'' نے اپنے قبیلوں کو پکارا تو دونوں کے جذبات بھڑک گئے اور ان کا آپسی تعصب بڑھ گیا جو روح اسلام کے بالکل خلاف تھا اور یہی

تعصب، فتنہ وفساد کا باعث بن گیا اسی کی وجہ سے ''عبداللہ بن ابی بن سلول'' جیسے منافق کو مناسب موقع مل گیا۔ اس نے پورے مجمع میں اپنی گندی روح پھونک دی جس سے جنگی شعلے بھڑک گئے کیوں کہ فتنہ پرست شیطان نے ایسا موقع فراہم کیا تھا۔

بنابرایں ہر مومن کو ہر وقت اپنی باتوں کی طرف متوجہ رہنا چاہئے تا کہ اس کی رفتار، گفتار اور کردار میں کسی طرح کا مذہبی، فرقہ وارانہ اور نسل وقبیلہ کا تعصب نہ آنے پائے کیوں کہ جب غصہ کے ساتھ تعصب ہوتا ہے تو انسان نما شیطانوں کے لئے بہترین موقع فراہم کر دیتا ہے کہ وہ فتنہ کا بیج بو دیں اور جو منافقین مسلمانوں کی صفوں میں موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں انھیں بھی اچھا بہانہ مل جاتا ہے کہ اپنی تمام بری سازشوں کو عملی جامہ پہنا دیں۔ ''شاس بن قیس'' کا فتنہ ایک خارجی دشمن کی جانب سے کھڑا ہوا تو ''عبداللہ بن ابی بن سلول'' کا فتنہ درحقیقت ایک ایسے منافق کی طرف سے کھڑا ہوا جو اپنے ہی لوگوں میں سے تھا۔ ہماری امت کے موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ اس طرح کے حادثات سے عبرت حاصل کی جائے تا کہ ہر اندرونی و بیرونی فتنہ پرست شخص سے ڈٹ کر مقابلہ کریں، کیوں کہ ہمارا اتحاد ہی ہماری کامیابی ونجات اور تمام دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کا ضامن بن سکتا ہے جب کہ تفرقہ و انتشار ہمارے اندر کمزوری، رسوائی اور شکست کا باعث ہے اس سے ہماری پریشانی بڑھتی ہے اور ہمارے حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔

۳۔ امت کے اندر اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے ایک سب سے اہم چیز یہ ہے کہ بعض منافقین اور ہوا پرست افراد کے تمام آزار واذیت کے مقابلہ میں ہم صبر وتحمل سے کام لیں خدا کی جانب سے ارشاد ہوتا ہے:

''...ولا تنازعو افتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا ان الله مع الصابرين''

''...اور تم لوگ آپس میں نزاع واختلاف نہ کرو ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمھاری وقعت کم ہو جائے گی اور صبر کرو بیشک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ (انفال/۴۶)

یہ وہی نکتہ ہے جس کی تاکید جناب رسول خداؐ نے کی جس وقت عمر بن خطاب نے آپؐ سے کہا تھا: اے خدا کے رسولؐ! آپؐ ''عباد بن بشر بن وقش'' کو حکم دیں تا کہ اس کا خاتمہ کر دیں۔ رسول اکرمؐ نے جواب دیا: اے عمر

! بھلا میں یہ کیسے ایسا کرسکتا ہوں کیا لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ محمدؐ اپنے اصحاب کو قتل کررہے ہیں؟ اتحاد برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فداکاری و بردباری سے کام لیا جائے اور اپنے لوگوں کی خطاؤں کو معاف کردیا جائے کیوں کہ اپنوں سے انتقام لینے کی وجہ سے فتنہ کھڑا ہوسکتا ہے اور اس سے ایسے حادثات پیدا ہو سکتے ہیں جن کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔

یہ تمام اسلامی ملکوں کے لئے ایک درس وعبرت ہے جن میں بہت سے ایسے گروہ موجود ہوتے ہیں جو جہالت ونادانی یا تعصب یا غیروں سے دوستی برقرار کرنے کی وجہ سے کچھ ایسے کام انجام دینے لگتے ہیں جن میں تمام لوگوں کے لئے مصلحت نہیں پائی جاتی پس اس کے لئے بہت سوجھ بجھ کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ امت کا اتحاد محفوظ رہے۔

۴۔ ''لیکن کوچ کا حکم دو'' ایک ایسا فرمان تھا کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمر بن خطاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا اور سب کو حیرت میں ڈال دیا کیوں کہ وہ کوچ کرنے کا کوئی وقت نہ تھا لیکن ماحول ایسا خراب ہو چکا تھا اور ''جہجاہ غفاری'' و ''سنان جہنی'' کے اختلاف کی وجہ سے حالات ایسے بگڑ چکے تھے اور اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی بن سلول جیسا منافق اس زمانہ کے مسلمانوں کے دو بڑے گروہ یعنی مہاجرین وانصار کے درمیان فتنہ برپا کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا جس کی وجہ سے حضرت رسول اکرمؐ نے ایسا فیصلہ کیا تھا یہ رہبری کے سلسلہ میں ایک بہت اہم درس ہے۔ رہبر کی عقلمندی وہوشیاری یہ تقاضا کرتی ہے کہ جب حالات بگڑ چکے ہوں تو فوراً جگہ کو تبدیل کردیا جائے تاکہ صورت حال پر کنٹرول ہوجائے اور وہاں کی فضا بدل جائے۔

۵۔ ''عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول'' نے اسلام قبول کیا اور ایک بہترین مسلمان بن گیا، مدینہ میں اسلام لانے سے پہلے اپنے اخلاق نیز والدین کا احترام کرنے اور ان کے ساتھ نیکی کرنے میں زبان زد عام وخاص تھا لیکن جب اس کو واقعہ کا پتہ چلا تو حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوکر آپ سے درخواست کرتے ہوئے یہ اجازت طلب کی کہ فتنہ برپا کرنے کی وجہ سے وہ خود اپنے باپ کو قتل کردے تاکہ بعد میں کوئی دوسرا مسلمان ایسا کام نہ کرسکے اور باپ کے قاتل سے انتقام لینے کا جذبہ اسے کسی مومن کو قتل کرنے پر مجبور نہ کردے، عبداللہ کا یہ جذبہ اور ہمت بڑی محترم تھی انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی صف میں اتحاد برقرار کرنے اور عمومی مصلحت کو اپنے ذاتی

فائدہ وجذبہ پر ترجیح دیا۔

حضرت رسول اکرمؐ نے بھی اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو ہر کمانڈر اور ہوشیار رہبر کرتا ہے اور آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''(صرف یہی نہیں کہ میں اس کو قتل کرنے کا حکم نہیں دوں گا) بلکہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا اور اسے معاف بھی کر دوں گا''۔ اس مقدس دین میں ایسے بہت سے واقعات ہیں جن میں مجرم وخطا کار افراد کے ساتھ نرمی برتی گئی ہے اور انھیں معاف کر دیا گیا ہے چنانچہ رحمت ومہربانی یہ اسلام کے بالکل ممتاز اصول میں سے ہے اور پیغمبرؐ رحمت نے اپنی گفتار وکردار میں اسے واقعی تجسم بخشا ہے۔

آج کل ہم بڑے دشوار حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور بہت سی مشکلات سے ہمارا مقابلہ وسامنا ہے۔ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنے معاشرہ کے اندر ہر قسم کے تعصب وافراط سے پرہیز کرتے ہوئے لوگوں کے ساتھ نرمی ومہربانی سے پیش آئیں اور اپنے رابطوں میں خوش رفتاری کو اصل قرار دیں، تاکہ الفت ومودت اور دوستی پیدا ہو سکے اور ہمارے درمیان اخوت و برادری قائم ہو سکے۔ تمام افراد میں اتحاد پیدا ہو سکے اور فتنوں کی جڑوں کو اکھاڑ دیا جائے کیوں کہ صرف یہی ایک ایسا راستہ ہے جس کے ذریعہ ملت کے تمام افراد ایک محکم بنیاد کے مانند ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر آپس میں سب کی حمایت کر سکتے ہیں۔

۶۔غزوۂ بنی مصطلق کا واقعہ اور اس کے بعد کے تمام واقعات آخر کار ''عمر بن خطاب'' کی اس بات پر ختم ہو جاتے ہیں جو انھوں نے آنحضرتؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہی تھی: ''خدا کی قسم مجھے اس وقت یہ معلوم ہو گیا کہ جناب رسول خداؐ کا فرمان ہمارے فرمان سے بہت زیادہ برکت رکھتا ہے''۔

یہ وہ چیز ہے جس کی ضرورت آج کل ہر ملک میں ہر مسلمان کو ہے چاہے وہ جس مذہب کا ماننے والا ہو، چاہے جس فلسفہ وسیاست کا قائل ہو اور چاہے جس حرفہ وفن وشغل میں مشغول ہو کیوں کہ تمام رفتار وکردار کو ایسے آئین نبوی کی بنیاد پر قرار دینا چاہئے جو آنحضرتؐ کی سیرت وسنت شریف میں مذکور ہیں، یہ ہمیں پرامن ساحل پر پہنچا دیں گے اور مشکلات کو حل کرنے میں ہماری مدد کریں گے اور خاص طور سے شیاطین ومنافقین جو ظاہری وباطنی فتنوں کے ذریعہ ہماری صفوں میں رخنہ اندازی کر رہے ہیں اور وہ دشمن وفرصت طلب لوگ جو باہر سے ہماری تمام اہم چیزوں کو غارت کرنا چاہتے ہیں اور برابر سازش کرتے رہتے ہیں ان سب کو مناسب جواب دیا جا سکتا ہے اور ہر

ایک کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

خاتمہ:

ہم نے ایسے حالات میں اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں کا استقبال کیا ہے کہ امریکی صہیونیستی استعماری سازش، عرب اور تمام اسلامی امت کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا ہونے کی صورت میں وہ لوگ کبھی اپنے ناپاک عزائم و مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکیں گے اسی لئے تمام مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ اسلام کے اس بنیادی قاعدہ کی پابندی کریں: ''اسلام کی بنیاد، عقیدۂ توحید اور اتحاد کلمہ پر استوار ہے''۔

منابع و مآخذ

۱۔ ابن اثیر، عزالدین ابوالحسن علی، کامل فی التاریخ، دارصادر، بیروت، چاپ ششم، ۱۴۱۵.

۲۔ ابن منظور، ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، دارصادر، بیروت، ج ۱۳.

۳۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، دارالکتب الحملیہ، بیروت، چاپ اول، ج ۲، ۱۴۲۲.

۴۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان عن تأ ویل آی القرآن، مکتبۃ نزار مصطفیٰ البارز، ریاض، ج ۳، ۱۴۱۵.

اسلامی اتحاد حضرت امام خمینیؒ اور آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں

ترجمہ: عون علی جاڑوی

مقدمہ

عصر حاضر میں اسلامی دنیا کو درپیش اہم ایک چیلنج یہ ہے کہ مسلم ممالک میں روز بروز مغربی ثقافت اور تمدن کا بول بالا ہوا جا رہا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اسلامی پہچان اور اسلامی اقدار کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے. یوں ایک طرف اسلامی دنیا سیاسی اور سماجی طور پر انحطاط کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور دوسری طرف پسماندگی کو بھی بڑھاوا ملا ہے ساتھ ہی ایک بڑی اور زیادہ طلب طاقت کے ساتھ اس کا سامنا بھی ہے. مغربی تہذیب کی مسلسل اور متعدد یلغار کے نتیجہ میں اس کے آثار اور خرابیاں مسلمانوں کی سوچ، ثقافت، سیاست اور اقتصاد پر نظر آنے لگی ہیں. اس خطرے کے مقابل اسلامی دنیا میں سیاسی اور سماجی ڈھانچوں میں مختلف قسم کے ردعمل میں دیکھنے میں آئے. ان میں سے اسلامی دنیا کی مشکلات کے حل کے لئے اسلام کی طرف واپس پلٹنے کے طرز عمل نے، دوسرے طریقوں کی نسبت بڑی قوت اور طاقت سے ایک مقامی روش کے طور پر گزشتہ دو صدیوں میں اسلامی ممالک کی تبدیلیوں میں بنیادی کردار ادا کیا ہے. اس نظریہ کے بانیوں نے مغرب کی تسلط پسند طاقتوں اور اپنی اندرونی مشکلات کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے، مسلمانوں کو آپس کے مذہبی تفرقوں سے پرہیز کرنے اور اپنے

اندر ''اسلامی اتحاد'' پیدا کرنے کا نظریہ پیش کیا ہے. اس تحریر میں کوشش کی گئی ہے کہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام خمینیؒ، اور رہبر معظم انقلاب حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں ''اسلامی اتحاد'' کے نظریہ پر روشنی ڈالی جائے.

ا قرآن کریم اور اسلامی اتحاد

کوئی بھی آگاہ اور بیدار مسلمان اگر قرآن مجید اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر نظر کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالی کے ان دو ذخیروں یعنی قرآن مجید اور پیامبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت، کی اہم ترین سفارشوں میں سے ایک سفارش ''اسلامی اتحاد'' ہے. تمام اسلامی مذاہب کے ماننے والے، چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی، ان کا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن کریم، اللہ تعالی کی طرف سے آنے والی وحی ہے اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قرآن مجید میں تحریف واقع نہیں ہوئی ہے، جبکہ باقی تمام ادیان کی آسمانی کتابیں تحریف سے محفوظ نہیں رہیں، لیکن قرآن مجید میں نہ تو کسی چیز کا اضافہ ہوا ہے اور نہ ہی اس سے کسی چیز کو کم کیا گیا ہے. کیونکہ اللہ تعالی نے خود اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے. (سورہ حجر/۹)

اسلامی اتحاد کی تحقیق کو اگر قرآن مجید میں اللہ تعالی کے کلام سے مستند کیا جائے تو وہ تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوگی کیونکہ تمام مسلمان اس کی سند اور اعتبار کو قطعی مانتے ہیں. قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے کہ انسانوں کے درمیان اختلاف اور فرق موجود ہے اور وہ فرق ایسا ہے جو پوری خلقت کے درمیان موجود ہے. یہ فرق تمام زندہ موجودات من جملہ انسان کی بقاء اور دوام کے لئے نہایت ضروری ہے(۱). البتہ اس فرق اور اختلاف کی وجہ سے انسان ایک دوسرے پر فخر اور برتری نہ جتلاتے رہیں، اس لیے اللہ تعالی نے ان کو اس نکتے کی طرف متوجہ کر دیا ہے کہ وہ سب ایک ہی ماں باپ سے ہیں اور اصل انسانیت میں اور انسانیت کی حقیقت میں ایک ہی ہیں. انسانوں میں برتری کا معیار تقوا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔(۲)

لیکن وہ اختلاف اور فرق جس کو قرآن نے مذموم اور قابل نفرت سمجھا ہے اور اس کا کئی جگہوں پر تذکرہ کیا ہے، یہ ہے کہ پوری زمین پر رہنے والے تمام انسان توحید کے قائل تھے لیکن وقت کے گزرنے سے ان میں اختلافات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے اللہ تعالی نے ان کے لیے شریعت کا انتظام فرمایا(۳). اللہ تعالی کے تمام پیغمبر چاہے وہ، جو صاحب شریعت تھے یا وہ، جن کے پاس الگ شریعت نہیں تھی، سب نے لوگوں کو توحید اور پورے جہان کے واحد خدا کے اوامر کے آگے جھکنے کی دعوت دی ہے. لیکن انسانوں نے اپنی ہوائے نفس کی

پیروی کرتے ہوئے، شریعتوں میں اختلاف کو اصل سمجھ لیا اور دینی معارف اور مبدا و معاد کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے، اور یوں دینی اتحاد میں رکاوٹ پیدا ہوگئی (۴)، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، مسلمانوں سے چاہتا ہے کہ گزشتہ تمام الٰہی پیغمبروں اور ان کے توحیدی دین پر ایمان لاتے ہوئے، دوسرے اہل کتاب کی طرح مت بنیں جنہوں نے اللہ تعالی کی طرف سے بھیجے گئے پیغمبروں کے درمیان فرق رکھ کر، علیحدہ علیحدہ دین بنا لیے ہیں. اسی بنیاد پر قرآن کریم نے ان تمام اختلافات کو ختم کرنے کے لیے، اہل کتاب کو دعوت دی ہے کہ وہ تمام شریعتوں کے اصلی اور مشترک جوہر یعنی توحید کو اپنائیں اور غیر خدا کی پرستش کو ترک کردیں:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُون" (آل عمران/۶۴)

کیونکہ قرآن کریم کی نظر سے شرک ناقابل بخشش گناہ ہے اس کے علاوہ اتحاد کی راہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے (۵) اور یہ دعوت امت واحدہ کی تشکیل کے لیے پہلا قدم ہے جس کی طرف قرآن کریم اشارہ فرماتا ہے۔

قرآن کریم کا اتحاد پر زور دینا صرف انسانوں کو واحد دین اور صرف خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دینا نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کو جو اس امت واحدہ کا حصہ ہیں، ان کو اندرونی اتحاد اور انسجام کی بھی دعوت دی گئی ہے. ان نکات میں سے جن پر قرآن کریم نے خاص توجہ دی ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالی کی خاص عنایت اور ارادہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم ہو (۶). چنانچہ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ میں اس پر زور دیا گیا ہے (۷). اس آیت میں اللہ تعالی تمام مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے کہ تم سب اللہ کی محکم رسّی سے متمسک ہو جاؤ اور آپس میں اختلافات اور تفرقہ سے اجتناب کرو. اس کے بعد قرآن کریم نے اتحاد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مسلمانوں کو یاددہانی کرائی ہے کہ تمہارے درمیان کس قدر اختلافات اور دشمنیاں تھیں، قریب تھا کہ تم ہلاک ہو جاتے، لیکن خدائے کریم نے تم پر احسان کیا اور اتحاد جیسی نعمت عنایت فرمائی۔

اور اسی طرح سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۴، ۱۰۵ میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو آپس میں تفرقہ و اختلاف سے منع فرمایا ہے اور مسلمانوں کو ایک امت کے سانچے میں ڈھال دیا ہے. استاد شہید مطہری نے ان آیات کی ترتیب سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں تمام بھلائیوں اور نیکیوں کی جڑ یہ ہے کہ مسلمان آپس

میں متحد اور متفق ہوں اور بری چیزوں میں اختلاف اور تفرقہ سے بڑھ کر کوئی بری چیز نہیں ہے.

اسی طرح شہید مطہری، سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''آج امت مسلمہ بہترین امت نہیں ہے''، اور اس بات کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت امت مسلمہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ترک کر دیا ہے جبکہ ان میں سے اہم ترین معروف یہی ہے کہ اتحاد کی دعوت دی جائے اور سب سے اہم منکر، اختلاف و تفرقہ ہے جس سے نہی کرنی چاہئے (۸). اسی طرح قرآن کریم نے سورۃ انفال کی آیت نمبر ۴۶ میں (۹) مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ ایک دوسرے سے اختلاف اور تفرقہ سے پرہیز کرو کیونکہ اس صورت میں تم پر سستی اور ضعف طاری ہوگا جس کی وجہ سے دشمن پر غلبہ حاصل کر لے گا.

لہٰذا قرآن کریم کی آیات میں تدبر کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کچھ نکات کی طرف توجہ کرنے سے اتحاد حاصل کیا جا سکتا ہے.

۱ توحید

انسانوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے لئے سب سے پہلا عامل یہ ہے کہ وہ سب اللہ تعالی کی وحدانیت کا اقرار کریں اور اس کے لئے کسی کو بھی شریک قرار نہ دیں (۱۰). کیونکہ جب انسانوں نے یہ مان لیا کہ اللہ تعالی کے علاوہ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے تو، اس کے فرامین کو بھی مانیں گے اور اگر ان کے درمیان کوئی اختلاف بھی واقع ہو تو، اللہ تعالی کے دین کے مطابق اس کو حل کر لیں گے (۱۱).

۲. پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی

سورۃ نجم کی تیسری اور چوتھی آیات کے مطابق، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی، اپنی ہوا و ہوس کے مطابق بات نہیں کرتے بلکہ وہی فرماتے ہیں جو آپ پر وحی ہوتی ہے (۱۲). اسی وجہ سے قرآن کریم نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کریں (۱۳)، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین سے منہ موڑ کر (۱۴) مسلمانوں کے معاشرے میں تفرقہ ڈال کر ان کو گروہوں میں تقسیم نہ کر دیں. اور اگر بھی کوئی اختلاف پیش آ جائے تو اللہ تعالی اور اللہ کے رسول کی طرف رجوع کریں اور ان کا حکم مان کر اختلاف و تفرقہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں (۱۵).

۳. رہبر اور قوم کے درمیان مہر و محبت

قرآن کریم کی نظر میں، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی کا راز اور یہ کہ لوگوں نے بہت جلد آپ کی باتوں کو قبول کر لیا، یہ تھا کہ آپ نیک اور اخلاق حسنہ کے مالک تھے قرآن کریم میں یوں ارشاد ہوا ہے:

''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظّاً غَلِيظَ الْقَلْبِ لاَنفَضُّواْ مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ''

(آل عمران/۱۵۹) اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی صراحت سے بیان فرما رہا ہے کہ: اگر پیغمبر سخت مزاج ہوتے تو کبھی بھی لوگوں کے دلوں میں جگہ نہ بنا سکتے اور نہ ہی اسلام کی طرف دعوت دے سکتے تھے.

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی سیرت میں بھی کئی ایسے موارد ملتے ہیں جن میں آپ نے مدارات اور شفقت سے کام لیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق حسنہ کی اتنی تاثیر ہے کہ قرآن کریم نے بھی اس کی تعریف کی ہے(۱۶).

۴. مسلمانوں کا آپس میں بھائی چارہ

دین اسلام میں جہاں مسلمانوں کو اتحاد اور اتحاد کلمہ کی دعوت دی گئی ہے، وہیں ان کے درمیان تعلقات کو بھی اس طرح منظّم کیا گیا ہے جو اسلامی معاشرے کی یکجہتی اور انسجام کو تقویت دے. اسی سلسلے میں قرآن کریم مؤمنین کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے(۱۷). علامہ طباطبائی (رہ) صاحب تفسیر المیزان، کا دوسرے بعض مفسرین سے اختلاف ہے، آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کے درمیان ایک طرح کی حقیقی اور واقعی برادری و اخوت کا معیار بتایا ہے، جس پر شرعی احکام و آثار مرتب ہوتے ہیں. قرآن مجید نے اس بھائی چارگی سے اس کا مجازی یا استعاری معنی مراد نہیں لیا ہے(۱۸).

اسی طرح سورہ حجرات کی گیارھویں اور بارھویں آیت میں مؤمنین کے ایک دوسرے پر حقوق کی وضاحت کی گئی ہے اور ایک دوسرے کا مذاق اڑانے، عیب جوئی کرنے، ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے رہنے، غیبت کرنے، بدگمانی کرنے اور ایک دوسرے کو برے القابات دے کر پکارنے سے منع کیا گیا ہے. ان آیات کو، آیت اخوت کے ساتھ، پے در پے بیان کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ مندرجہ بالا ناپسندیدہ صفات مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے کے لئے سے رنجش و نفرت کا باعث بن سکتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اخوت و برادری کا رشتہ ختم ہو جائے گا، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان دشمنی پیدا ہو جائے، اور اسلامی معاشرے کے اتحاد کو ٹھیس پہنچے.

اس کے علاوہ قرآن کی دوسری بہت سی آیات بھی مسلمانوں کو پسندیدہ اخلاق جیسے احسان، انفاق، سچائی وغیرہ... جیسے صفات کی جانب دعوت دیتی ہیں. اس طرح اخلاق حسنہ کی سماج میں توسیع اور قبولیت خود ایک اہم عامل بن سکتی ہے کہ سماج کے اندر، امن وسلامتی اور اسلامی معاشرہ میں ہمدلی اور بھائی چارہ کو فروغ ملے اور اس کے بر عکس قرآن کے بیان کردہ اخلاق حسنہ کو نظرانداز کرنے سے انسان کے دیرینہ دشمن (یعنی شیطان) کو موقع مل جاتا ہے کہ ان بداخلاقیوں کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان نفرتوں اور عداوتوں کا بیج بوئے (۱۹).

۲. حضرت ختمی مرتبتؐ اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد

الف) حکومت کی تشکیل

مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا ماحول پیدا کرنے کے سلسلے میں مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد، آنحضرتؐ کی طرف سے حکومت قائم کرنے کو آپؐ کے سب سے اہم عملی اقدامات میں سے شمار کرنا چاہئے.

کیونکہ ایک سیاسی نظام اور اس کے متعلقات کے بغیر امت واحدہ کی تشکیل (جس کی قرآن کریم میں بہت شدت سے تاکید کی گئی ہے) کے لئے زمین ہموار نہیں ہوسکتی تھی.

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں دو اہم قبیلوں (اوس اور خزرج) کے درمیان اتحاد قائم کیا تھا. ان دونوں قبیلوں کا جاہلی تعصّبات کی بنا پر کئی برسوں سے اختلاف چل رہا تھا، لیکن یہی لوگ جب پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کی دعوت تبلیغ سے آشنا ہوئے تو آپ کو صلح اور آشتی کے لئے سب سے افضل پایا. اور یوں یثرب میں دوبارہ پرسکون ماحول واپس پلٹ آیا. اس کے بعد جب آپ مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو وہاں پر ایک مسجد کی تعمیر بھی فرمائی جو بہت اہمیت کی حامل ہے. یہ مسجد مسلمانوں کی عبادت اور اسی طرح سیاسی امور کو نپٹانے کے لئے بنائی گئی تھی.

ب) مہاجرین وانصار کے درمیان عقد اخوت

ہجرت کے چند مہینے بعد، مسلمانوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب کرنے اور اخوت و برادری کے احساس کو زیادہ قوت دینے کے لئے، حضورؐ نے جو اہم قدم اٹھایا، وہ مسلمانوں کے درمیان عقد اخوت و برادری کا انعقاد تھا. اس واقعہ میں زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس عقد اخوت میں ذاتی، خاندانی یا قومی عوامل کارفرما نہیں تھے. مسلمانوں کے نئے تشکیل پانے والے معاشرے پر اس عقد اخوت کی وجہ سے مرتب ہونے والے آثار وثمرات

حسب ذیل ہیں:

۔مدینہ میں سکونت پذیر مہاجرین کی غربت وتنہائی میں کافی حد تک کمی آئی اور اس طرح ان کے لئے ہم نشین اور ہمدل ساتھی مل گئے.

۔اس کے باوجود کہ جاہل عربوں کے درمیان قبائلی اور خاندانی مسائل بہت اہمیت کے حامل تھے، حضورؐ نے عقد اخوت جاری کرتے وقت ان مسائل سے مکمل طور پر لاتعلقی اختیار فرمائی اور اس کو کم رنگ کرنے کی کوشش کی، تا کہ اس کے ذریعہ قومی اور نسلی اختلافات کو کم کیا جا سکے.

۔اسلامی اخوت اور برادری کے نظام سے وجود میں آنے والے عام اتحاد کی اصلی بنیاد، اللہ تعالی پر ایمان رکھنے کے علاوہ کچھ نہ اور تھی اور یہ مدینہ کے تازہ مسلمان معاشرے میں خود ایک قسم کی نئی ثقافت اور نئی تہذیب کی ایجاد تھی، تا کہ لوگ جان لیں کہ اس کے بعد ہر چیز کا معیار صرف اللہ تعالی کی ذات ہی ہے (۲۰).

ج) اہل مدینہ کے درمیان ایک قرارداد

حضورؐ نے خود مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں کے درمیان آپسی رابطہ اور ان کا دوسرے غیر مسلم لوگوں کے ساتھ رابطہ کو منظّم کرنے کے لئے ایک قرارداد مرتب فرمائی. اس قرارداد میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد پر تاکید کی گئی. مسلمانوں کے آپس میں اتحاد کے سلسلے میں اس قرارداد کی کچھ شقیں یہ ہیں:

۔تمام مؤمنین اور باتقوا لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ ہر سرکش، باغی، فسادی اور امن وسلامتی کا ماحول بگاڑنے والے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور سب مل کر ایسے مجرموں کا مقابلہ کریں، چاہے ایسے افراد میں ان کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو.

۔مؤمنین کے درمیان ایک دوسرے سے صلح ومصالحت اجتماعی صورت میں ہوگی اور کسی مؤمن کو یہ حق نہیں ہوگا کہ اللہ تعالی کی راہ میں لڑی جانے والی جنگ میں ایک دوسرے سے الگ ہو کر دشمن سے صلح کر لے، کیونکہ یہ حق ہر مؤمن کو برابر دیا گیا ہے.

۔اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے ہر مؤمن کے خون کے ولی، تمام مؤمنین ہوں گے.

۔جب بھی تم (مؤمنین) کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو تو اس کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی طرف رجوع کرنا ہوگا.

۔انتقام کی آگ بھڑکا کر پرانے زخموں کو تازہ نہیں کیا جائے گا اور جس شخص نے بھی دوسروں کو ستانے یا قتل کرنے

کا ارادہ کیا، گویا اس نے خود کو اور اپنے خاندان والوں کو قتل و آزار کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے. البتہ جو لوگ مظلوم واقع ہوں ان کو قصاص کرنے کا پورا حق ہے، اور اللہ تعالی بھی اس کام پر راضی ہے (۲۱).

مذکورہ قرارداد میں کچھ نکات کی طرف نشاندہی کی جاتی ہے:

۱.حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس پیمان نامہ میں مدینہ میں بسنے والے تمام مسلمان اور غیر مسلم لوگوں پر اللہ تعالی اور اس کے رسول کی حاکمیت کی تاکید کی گئی ہے.

۲.مسلمانوں کے درمیان داخلی اتحاد پر زور دیا گیا ہے جو اس امر کی اہمیت اور اس مسئلہ کو قرارداد کی دوسری شقوں پر برتری دلاتا ہے.

۳.اس قرارداد میں حضورؐ نے پرانے قومی اور قبیلوں کے اختلافات کو دوبارہ زندہ کرنے سے منع فرمایا ہے.

قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ مسلمانوں کو تفرقہ سے دور رکھا جائے اور بھائی چارگی پر تاکید کی ہے مگر انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صدر اسلام سے ہی اس اصل کو مخدوش کر دیا گیا.

حصول اقتدار کے لئے آپس میں ہی اختلاف و نزاع کو ہوا دی گئی جس نے مسلمانوں اور اسلامی اتحاد کو کمزور کر دیا اور اسلامی دنیا کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑا.

جدید دور میں اسلامی دنیا کا مغربی تہذیب سے ٹکراؤ اور سامنا مسلمانوں کو ایک نئی مشکل سے دوچار کر رہا ہے.

ایک طرف مسلمانوں کی ثقافت پر مغربی دنیا کی مسلسل یلغار اور دوسری طرف مسلمانوں کے زوال نے مسلمان رہنماؤں کو بیدار کر دیا تا کہ قوم کے دردوں کو پہچانا جائے اور ان کو دور کرنے کے لئے چارہ جوئی کی جائے. اور یوں اسلامی دنیا میں اتحاد اور اسلامی سماج میں اصلاحات کرنے کی صدائیں سنائی دینا شروع ہو گئیں. اس دور میں ایسے دانشور دیکھنے میں آئے جو اپنی بساط کے مطابق مسلمانوں کی مشکلات کو حل کرنے کی سوچ رکھتے تھے اور غالباً ان سب کی نظر میں پہلی راہ حل مسلمانوں کا اتحاد ہی تھا. چنانچہ مکتب اہل بیت علیہم السلام کے پیروکار علماء نے بھی اپنے معصوم اماموں کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی دنیا کے مختلف مذاہب میں اتحاد قائم کرنے اور اس کی حفاظت اور وسعت دینے کے لئے خاص اہتمام کیا ہے. اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام خمینیؒ اور حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای جیسے مصلح اور متفکر حضرات، اتحاد کے سلسلے میں واحد نظریہ رکھتے ہیں اور وہ مشترک اسلامی اصول کی بنا پر اسلامی مذاہب کے درمیان، تعاون و یکجہتی کو فروغ دینا اور امت مسلمہ کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے واحد موقف اختیار کرنا ہے، ساتھ ہی اسلام کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک ہی موقف رکھنا ہے. اس تحریر میں اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی، حضرت امام خمینیؒ اور رہبر انقلاب حضرت آیۃ

اللہ العظمی خامنہ ای کی نظر میں اسلامی اتحاد پر ایک تحقیق پیش کی جارہی ہے.

حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں ''اسلامی اتحاد''

اتحاد کی ضرورت

حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں ''اتحاد'' الٰہی ادیان اور الٰہی پیغمبروں کے اہم ترین اغراض ومقاصد میں سے ہے، اور اتحاد نہ صرف خود ایک اہم مقصد ہے بلکہ دوسرے بڑے مقاصد کو حاصل کرنے اور مدینہ فاضلہ کی تشکیل میں اس کا بہت اہم کردار ہے. آپ قرآن کریم کی آیات واحادیث سے استفادہ کرتے ہوئے، اتحاد کو ایک شرعی فریضہ سمجھتے ہیں جو اسلامی سماج کے فرد فرد پر عائد ہوتا ہے جو ان کو یہی ترغیب دلاتا ہے کہ جو چیز بھی مسلمانوں کی مجموعی مصلحتوں کے خلاف ہو اس سے پرہیز کریں ورنہ اللہ تعالی کے غیظ وغضب سے دوچار ہونا پڑے گا (۲۲).

حضرت امام خمینیؒ نے ایران کے اسلامی انقلاب سے چودہ سال پہلے بھی، یہ بیان فرمایا تھا کہ میری تحریک کا مقصد، مسلمانوں کے درمیان یکجہتی اور صہیونیزم اور سامراجی ممالک کے خلاف اسلامی ممالک میں اتحاد پیدا کرنا ہے (۲۳). یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی کے نظریات میں اسلامی اتحاد کا منصوبہ صرف ایک قسم کی سیاسی تبلیغ نہیں تھی جس کی بنا پر وہ اسلامی دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے، اسلامی جمہوریہ ایران کے لئے کوئی مقام حاصل کرنا چاہتے تھے، بلکہ اسلامی اتحاد حضرت امام خمینیؒ کے نظریات کا ایک مستقل ستون ہے.

حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کا اصل راز، قوم کا اتحاد ہی ہے. اور اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اس اتحاد کا حصول بھی اللہ تعالی کی خاص عنایت تھی (۲۴)، آپ اسلامی نظام کے استحکام، ملکی اور غیر ملکی مشکلات پر غلبہ پانے اور اسی طرح انقلاب کو حوادث سے بچانے کے لئے اس اتحاد کو قائم رکھنے پر زور دیتے ہیں (۲۵). آپ عالمی سطح پر بھی اتحاد کو مسلمانوں کے لئے سب سے اہم ضرورت سمجھتے ہیں اور اتحاد کے سایے میں صدر اسلام میں مسلمانوں اور اسلامی انقلاب کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے، اسلامی دنیا کی مشکلات کے حل کو بھی اسی نمونہ سے پیروی کرنے میں پوشیدہ سمجھتے ہیں.

''اگر اسلامی حکومتیں، اپنے اسلامی فرائض پر عمل کریں اور آپس کے اختلافات کو ختم کر کے تمام حکومتیں اسلام کے پرچم تلے اکھٹی ہو جائیں تو تمام ممالک کی مشکلات حل ہو جائیں گی'' (۲۶).

امام خمینیؒ کی نظر میں اتحاد کے میدان

الف. اسلام پر سچے دل سے ایمان لانا اور اس کے فرامین پر عمل کرنا.

حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں اسلام کو قبول کرنا اور اسلامی فرامین پر عمل پیرا ہونا، اور قرآن کریم سے وابستگی و تمسک، اسلامی اتحاد کی راہ میں پہلا قدم ہے. اگر یہ نہ ہوں تو پھر اگلے قدم نہیں اٹھائے جا سکتے (۲۷).

آپ اس آیت کریمہ ''وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعاً وَلاَ تَفَرَّقُواْ'' (آل عمران/۱۰۳) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر مسلمانوں نے اس آیت کریمہ پر عمل کیا ہوتا، تو تمام مشکلیں دور ہو جاتیں اور کوئی بھی طاقت ان کے مدمقابل نہیں آ سکتی تھی. اگر مسلمانوں نے اپنی روش تبدیل نہ کی تو مشکلیں اور بھی بڑھتی جائیں گی (۲۸). اسی وجہ سے حضرت امام خمینیؒ نے اپنے سیاسی۔الٰہی وصیت نامے میں اتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں قرآن کریم کے بنیادی کردار کی طرف اشارہ کیا ہے اور ساتھ ہی اظہار افسوس بھی کیا ہے کہ مسلمانوں نے اب تک کیوں غفلت برتی ہے؟! قرآن کریم کو... میدان عمل سے ایسے باہر کر دیا، گویا قرآن کریم لوگوں کی ہدایت میں مؤثر ہی نہیں ہے. جو کتاب مسلمانوں کے مابین اتحاد اور اتحاد کا مرکزی نقطہ بن سکتی ہے، وہی باعث اختلاف و تفرقہ بن گئی ہے اور اس کو مکمل طور پر زندگیوں سے خارج کر دیا گیا ہے (۲۹).

ب. فلسطین کا مسئلہ

حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں امت مسلمہ کے اتحاد کا اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ مل کر بیت المقدس کی آزادی کے لئے کوشش اور صہیونیزم کے ساتھ مقابلہ کیا جائے حتی ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل، حضرت امام خمینیؒ نے ۱۳۴۷ شمسی کو فلسطینی تنظیم ''الفتح'' کے نمائندے کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں اشارہ فرمایا تھا: ''دنیا کے تمام مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ اپنی مادی اور معنوی طاقتوں کو بروئے کار لا کر صہیونیزم سے مقابلہ کریں''.

حضرت امام خمینیؒ، شرعی وجوہات کا کچھ حصہ، فلسطینی مجاہدین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے استعمال کرنے کو جائز سمجھتے تھے (۳۰).

حضرت امام خمینیؒ نے اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ہونے والی جنگ میں مسلمانوں کو جہاد اور مقابلہ کی دعوت دی، اور اسلامی و عربی حکومتوں سے درخواست کی تھی کہ اس عظیم امر میں کوتاہی نہ کریں. بلکہ آپ تو تمام حریت پسند اور آزادی پسند افراد سے مطالبہ کرتے تھے کہ فلسطین کے مسئلہ کو نظر انداز نہ کریں. بلکہ ایک آواز بن کر، اسرائیلی مظالم کے خلاف احتجاج کریں (۳۱).

شاید فلسطین کے مسئلہ کو زندہ رکھنے اور اسلامی دنیا میں یکجہتی پیدا کرنے کے لئے کیے جانے والے ان سب اقدامات میں سے حضرت امام خمینیؒ کی طرف سے یوم القدس کے اعلان کی طرح کوئی بھی اقدام مؤثر اور دیرپا نہیں رہا ہے.

۱۳۵۸ ہجری شمسی کو حضرت امام خمینیؒ نے اپنے پیغام میں اعلان فرمایا تھا کہ: ''ہم دنیا کے تمام مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں سے چاہتے ہیں کہ غاصب حکومت اور اس کے حامیوں کا ہاتھ کاٹنے کے لئے، آپس میں متحد ہو جائیں اور تمام مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ ماہ مبارک رمضان کے آخری جمعہ کو جو ''ایام قدر'' میں سے ہے، اور اس دن فلسطینی عوام کی قسمت بدل سکتی ہے، ''یوم القدس'' کا نام دے کر فلسطین کے مسلمان عوام کے حق میں پوری دنیا کے مسلمانوں کی طرف سے بین الاقوامی یکجہتی کا اظہار کیا جائے'' (۳۲).

ج). حج

حضرت امام خمینیؒ کی نگاہ میں حج کا عبادی۔ سیاسی فریضہ، اللہ تعالی کی دی ہوئی بہت عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے جو امت مسلمہ کے اتحاد کے لئے مناسب موقع ہے. حضرت امام خمینیؒ، حج کو الٰہی معارف سے بھرپور مجموعہ سمجھتے ہیں جس سے اسلامی سیاست کے اصول لیے جا سکتے ہیں (۳۳). حضرت امامؒ کی نظر میں حج کا فلسفہ صرف دو ہی چیزوں میں منحصر ہوتا ہے، وقت کی طاغوتی طاقتوں کے سامنے مسلمانوں کا متحد ہو جانا اور اسلامی ممالک کی سماجی۔ سیاسی مشکلات کا جائزہ لینا (۳۴).

حضرت امام خمینیؒ اپنے پیغامات اور اپنی تقاریر میں فریضہ حج کو ایسی فیوضات و برکات کا حامل سمجھتے ہیں جن سے حج کے دوران استفادہ کر کے، مسلمان، حج کے اصلی فلسفہ کے قریب آ سکتے ہیں، جن میں سے اہم ترین حسب ذیل ہیں:

۱. حج، ایک مناسب موقع ہے کہ دانشور، روشن خیال اور اسلامی ممالک کے علماء اپنے آراء و افکار پر تبادلہ خیال کریں اور عالم اسلام کی مشکلات کا حل تلاش کریں، مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا اور انھیں ایک عمومی اسلامی انقلاب کے لئے تیار کرنا، تا کہ اسلامی اخوت اور انسانی اتحاد کے ذریعہ سامراج اور طاغوت سے چھٹکارا حاصل کر سکیں (۳۵).

۲. مسلمانوں کو شیعہ و سنی کے درمیان تفرقہ ڈالنے والے عناصر سے آگاہ کرنا اور مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دینا (۳۶).

۳.مشرکین سے برائت و بیزاری کا اظہار کرنا، جو مجاہدوں کی طرف سے کفر و شرک و بت پرستی سے کے خلاف جہاد کرنے کے لئے، تجدید میثاق اور اس کی تمرین ہے (۳۷).

۴.حرم امن الٰہی میں دنیا کے تمام مسلمانوں کو مشکلات و مصائب بیان کرنے کی آزادی ہوتا کہ سارے مسلمان راہ حل تلاش کر سکیں (۳۸).

۵.مسلمانوں کی عملی زندگی میں قرآن کریم کے کردار کو زیادہ اجاگر کرنا (۳۹).

حضرت امام خمینیؒ اسی وجہ سے موسم حج میں شیعہ حضرات کو اہل سنت کی اقتداء میں نماز جماعت میں شرکت اور سنی قاضیوں کی پیروی کرنے کو جائز سمجھتے تھے (۴۰).

د) جذبہ شہادت

حضرت امام خمینیؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر کوئی قوم موت سے نہ ڈرے گی تو پھر بڑی سے بڑی طاقت بھی اپنے ناپاک عزائم اس قوم پر مسلط نہیں کر سکتی. آپ دنیا کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں: ''موت کے خوف پر غلبہ حاصل کیجئے، شہادت کا جذبہ رکھنے والے جوانوں سے بھرپور فائدہ اٹھائیے جنہوں نے کفر کے محاذ کو تہس نہس کرنے کی ٹھان لی ہے. موجودہ حالات پر اکتفاء نہ کریں.... کیونکہ عزت و حیات کا دارومدار مجاہدت پر ہے جس کا پہلا قدم مجاہدت کا پکا ارادہ ہے'' (۴۱). آپ کے نقطہ نظر سے، تاریخ میں ایسی تبلیغات کی گئی ہیں کہ بڑی طاقتوں کو ناقابل شکست دکھا کر پیش کیا جائے، لیکن ایران کے اسلامی انقلاب نے دنیا کو دکھا دیا کہ اگر کوئی قوم متحد ہو جائے اور خوفزدہ نہ ہو تو پھر کوئی بھی بڑی طاقت اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور ان کی تقدیرات سے نہیں کھیل سکتی (۴۲).

ھ). اہل بیت علیہم السلام

حضرت امام خمینیؒ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اہل بیت پیغمبرؐ سے محبت اور تمسک، اسلامی مذاہب کے لئے اتحاد ساز اور ایک نقطہ اشتراک ہے. آپ نے اپنے الٰہی۔سیاسی وصیت نامہ کا آغاز حدیث ثقلین سے کیا ہے، جس کو تمام مسلمانوں نے تواتر کے ساتھ ذکر کیا ہے جو اہل سنت برادران کی مختلف کتابوں من جملہ صحاح ستہ میں موجود ہے، یہ حدیث تمام انسانوں پر بالعموم اور تمام مسلمانوں پر بالخصوص حجت کو تمام کر دیتی ہے. آپ فرماتے ہیں: ''ہم پوری سنجیدگی اور عاجزانہ طور پر تمام ملت مسلمہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ان انسانیت کے بڑے رہنماؤں سے ثقافتی، سیاسی، سماجی، اقتصادی اور عسکری سبق حاصل کریں اور پورے دل و جان سے، حتی کہ اپنے

عزیزوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے بھی ان حضرات کی پیروی کریں'' (۴۳).

امام خمینیؒ کی نظر میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کی وجوہات

الف) سامراج

حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں امت مسلمہ اور اسلامی حکومتوں کے مابین اختلافات ڈالنے اور ان کو ہوا دینے کا ایک سبب سامراج اور سامراجی حکومتیں ہیں جنہوں نے امت مسلمہ کے مادی اور معنوی خزانے ہتھیانے کے لئے شیعہ اور سنی یا دوسرے عناوین کو آگے لا کر اختلاف ڈالا ہے (۴۴).

لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اس سلسلے میں ہوشیاری سے کام لیں اور اگرچہ آج سامراج کے پرانے طریقے منسوخ ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے اپنا تسلط جمانے کے لئے نئے طریقے تلاش کر لیے ہیں اور کبھی دہشت گردی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بہانے مسلمان ممالک میں جا پہونچتے ہیں. یہ وہی چیز ہے جس کو ہم مشرق وسطی میں اکیسویں صدی کے سامراج میں دیکھ رہے ہیں.

ب) قوم پرستی

حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں دوسرا عامل جو امت مسلمہ کے اتحاد میں حائل بنا ہوا ہے، وہ قوم پرستی اور نیشنلزم کی ترویج و توسیع ہے. آپؒ قوم پرستی کو دین اسلام اور قرآن کریم کی تعلیمات کے خلاف سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ اسلامی ممالک کا آپس میں اختلاف اور اسلام و مسلمین کی بھلائی کو بھلا دینے کے علاوہ کچھ نہیں. اس قسم کے نظریات کے پھیلنے سے، مسلمان ایک دوسرے کی تقدیرات کے لئے کسی اہمیت کے قائل نہ رہتے اور فلسطین جیسے مسئلہ کو نظرانداز کر دیتے ہیں جہاں مسلمانوں کی مادی اور معنوی مدد درکار ہے. لہذا حضرت امام خمینیؒ کی نظر میں قوم پرستی پر مبنی نظریات کو پھیلانے میں اجنبیوں کی سازشیں اور مذموم منصوبے کام کرتے ہیں. آپ قوم کے برجستہ اور منتخب اہل فکر و قلم سے چاہتے ہیں کہ عوام کو ان نظریات کے خطروں سے آگاہ کریں (۴۵).

ج) تفرقہ انگیز اعمال

ایک اور عامل جو شیعہ و سنی اختلافات کو مزید گہرا کر رہا ہے، اس میں وہ بعض اعمال ہیں. من جملہ ایک دوسرے کے خلاف اہانت آمیز مواد پر مشتمل کتابوں کی نشر و اشاعت، دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو کافر کہنا وغیرہ... اسی وجہ سے حضرت امام خمینیؒ اس قسم کے اعمال کے بارے میں حساس تھے اور شیعوں، خاص طور پر

حج پر تشریف لے جانے والے بیت اللہ الحرام کے زائرین سے چاہتے تھے کہ ہر قسم کے تفرقہ اور شر انگیز اعمال سے پرہیز کریں اور اس کو ایک شرعی فریضہ سمجھیں (۴۶).

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای اور اتحاد اسلامی کا نظریہ

حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای کی نظر میں اتحاد کی ضرورت

حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای کی نظر میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد ایک دینی فریضہ ہے، اسی وجہ سے آپ تمام مسلمین خاص طور پر اسلامی سماج کے برجستہ افراد سے چاہتے ہیں کہ اتحاد کو وجود میں لانے کے لئے پوری کوشش کریں (۴۷). رہبر معظم انقلاب کی نظر میں مسلمانوں کی مشکلات کی اصلی جڑ، ان میں تفرقہ اور اتحاد کا فقدان ہے. آپ ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی میں اتحاد کلمہ کے کردار کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اس کو امت مسلمہ کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انتہائی ضروری سمجھتے ہیں (۴۸). آپ کی نظر میں امت مسلمہ کے لئے اتحاد سے حاصل ہونے والے نتائج حسب ذیل ہیں:

۱. اللہ تعالی کے وعدوں کا پورا ہونا (۴۹).

۲. مسلمانوں کے درمیان طاقت اور عظمت کا احساس پیدا ہونا جس کی وجہ سے وہ عالمی طاقتوں سے مرعوب نہ ہوں گے (۵۰).

۳. امت مسلمہ کا اپنی تقدیرات پر مسلط ہونا اور اجنبیوں کے تسلط سے رہائی پانا (۵۱).

۴. علمی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی جیسے میدانوں میں ترقی (۵۲).

۵. دنیا میں اسلامی اقدار کو قطعی اور قابل عمل اقدار کے طور پر متعارف کرانا (۵۳).

گزشتہ چند سالوں میں مشرق وسطیٰ میں پیش آنے والے خاص حالات کی وجہ سے امت مسلمہ کے اتحاد کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے. چنانچہ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے ۱۳۸۶ ہجری شمسی یعنی ۲۰۰۷ء کے سال کو ''قومی اتحاد اور اسلامی انسجام'' کا نام دیا تھا.

آپ نے اسی سال کی ابتدا میں نوروز کے پیغام میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ایرانی قوم کو نقصان پہنچانے کے لئے، دشمنوں کی ایک چال یہی ہے کہ قوم کے درمیان تفرقہ اور اختلاف ڈالا جائے اور ایرانی قوم کی یکجہتی کو نقصان پہنچایا جائے، فرمایا: ''...اسلامی دنیا کی سطح پر بھی دشمن کی طرف سے اسی قسم کی ایک بہت بڑی سازش محسوس ہو رہی ہے، جس کے ذریعہ وہ ایرانی قوم اور دیگر مسلمان قوموں کے درمیان اختلاف

اور فاصلے ڈالنا چاہتے ہیں؛ مذہبی اختلافات کو بڑا دکھا کر، دنیا میں جہاں بھی ہو سکے، شیعہ اور سنیوں کے درمیان اختلافات بڑھانا چاہتے ہیں اور ایرانی قوم کی عظمت اور شوکت (جو الحمدللہ دن بدن بڑھ رہی ہے) اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں''.

اتحاد کا معنی

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں اتحاد کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ شیعہ، سنی بن جائیں یا سنی حضرات شیعہ بن جائیں، بلکہ اتحاد کا معنی یہ ہے کہ مختلف اسلامی مذاہب کے پیروکار:

۱.اسلامی دنیا کے مسائل اور مشکلات (دشمنوں کے ساتھ جہاد وغیرہ...) میں شانہ بہ شانہ ہوں. اپنا سرمایہ اور اپنی طاقت کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ کریں (۵۴).

۲.ایک دوسرے کی اہانت اور توہین کرنے کی بجائے، علمی اور منطقی بحثیں کی جائیں تا کہ ایک دوسرے کے بارے میں موجود غلط فہمیوں کو دور کر دیا جائے، ساتھ ہی ایک دوسرے کے درمیان موجود مشترک نکات، خاص طور پر فقہی مسائل میں مشترکات کو تلاش کر کے ٹکراؤ اور اختلافات کو کم کیا جائے تا کہ تفاہم کی فضا پیدا ہو (۵۵).

البتہ اس قسم کے اتحاد کو حاصل کرنے کے لئے کچھ مقدمات درکار ہیں. حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں جو لوگ واقعی طور پر اتحاد کی کھوج میں ہیں ان کو:

۱.کوشش کرنی چاہئے کہ گزشتہ زمانوں میں جہالت اور نادانی کی وجہ سے پیش آنے والے مسائل (من جملہ ایک دوسرے کی توہین کرنا اور ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھنا وغیرہ...) کو دوبارہ زندہ نہ کیا جائے اور ایک دوسرے کو ان کتابوں کا حوالہ نہ دیا جائے (۵۶).

۲.اتحاد کے حصول کے لئے ایک دوسرے پر زیادہ اور لاحاصل شرطیں نہ رکھی جائیں، کیونکہ یہ خود اتحاد کے وجود میں آنے میں رکاوٹ ہیں (۵۷).

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں اتحاد کے میدان

الف) حج

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں حج، مسلمانوں کے اتحاد کا جلوہ اور نمونہ ہے. حج میں مسلمانوں کو معرفت اور شناخت کا ایسا مجموعہ نصیب ہوتا ہے جو دوسری کسی بھی جگہ مسلمانوں کو اس طرح یکجا میسر نہیں آ سکتا. آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے وجود کے بارے میں سوچ کر اپنی کمزوریاں یا اپنی طاقتوں کے بارے میں

''خودشناسی'' حاصل کرتا ہے(۵۸) اور یہ سب مقدمہ ہے تا کہ اپنے آپ کو امت مسلمہ کے عظیم مجموعہ(۵۹) کا چھوٹا حصہ سمجھے جو اسلامی اتحاد کو وجود میں لانے کے لئے ایک عملی قدم آگے بڑھا رہا ہو اور نتیجۂ عالمی سیاست میں ایک اسلامی بڑی طاقت کے طور پر ابھرے(۶۰). اسی طرح اللہ تعالی کی عظمت و رحمت(۶۱) اور اپنے دشمن کی شناخت(۶۲) حاصل کر لے. رہبر معظم انقلاب کی نظر میں پہلی شناختوں کا نتیجہ اور ان کو مکمل کرنے والی شناخت یہی اپنے دشمن کی شناخت ہے، یہ تمام ایسے معارف ہیں جو انسان کو حج ہی میں مل سکتے ہیں.

حج کے فوائد

ا.توحیدی نظریہ کی تقویت

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ کی نظر میں، حج کی بنیادی تعلم اور اس کے بہت سارے اعمال و مناسک کی اصلی روح، ''توحید'' ہے. آپ توحید کے گہرے اور قرآنی مفہوم کی یوں تفسیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی کی طرف توجہ اور اس کی طرف چل پڑنا، تمام بتوں اور شیطانی طاقتوں کی نفی کر دینا جن میں سے سب سے زیادہ خطرناک طاقت انسان کے وجود کے اندر، ''نفس امارہ'' اور سماج اور دنیا کی سطح پر سامراجی اور فتنہ انگیز طاقتیں ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی حیات کو اپنے چنگل میں لے کر اپنے شیطانی طریقوں سے، بہت سی مسلمان قوموں کے جسم و روح کو اپنی ناپاک سیاستوں کے بھینٹ چڑھا رکھا ہے(۶۳). لہذا مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ حج کے ایام میں، ان طاقتوں سے برائت و بیزاری کا اعلان کریں. آپ حضرت ختمی مرتبتؐ کی طرف سے حج کے ایام میں مشرکین سے اعلان برائت و بیزاری پر تاکید کو بھی اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں(۶۴).

۲.اتحاد اور اخوت کی تمرین

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں، حج اجتماعی حرکت اور الہی دعوت ہے تا کہ مسلمان اتحاد کے اس عملی نمونے کو ایک اجتماع کی شکل میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکیں(۶۵). دنیا کے کونے کونے سے، مختلف زبانوں، مختلف رنگوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے جوق در جوق حاجیوں کو دیکھنے سے ایک تو مسلمانوں کے افق نگاہ میں وسعت پیدا ہوگی اور ساتھ ہی صرف اپنی ذات اور قوم و ملک تک محدود سوچ کو وسعت ملے گی اور ان کے نیز دوسرے مسلمانوں کے درمیان ہمدلی اور یکجہتی کی فضا پیدا ہوگی. اسی طرح بلا واسطہ، مغربی جھوٹے میڈیا کے بغیر، مسلمان اقوام ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوں گے، اور دشمن کی اس قسم کی سازشوں کو ناکارہ بنا دیں گے(۶۶).

۳.مسلمانوں میں عظمت کا احساس پیدا ہونا

رہبر انقلاب کی نظر میں امت مسلمہ کے لئے حج کے دوسرے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے اس عظیم اور باشکوہ و پر جلال اجتماع کو دیکھ کر، مسلمانوں میں عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے وجود سے تنہائی کا احساس جاتا رہتا ہے اسی طرح ان میں اسلام دشمن طاقتوں سے مقابلہ کی ہمت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور مسلمان حکومتیں بھی اپنے عوام پر بھروسہ کرتے ہوئے، اجنبی طاقتوں پر اعتماد اور بھروسہ کرنے سے بے نیاز ہو جائیں گی، یوں مسلمان اقوام اور ان کی حکومتوں کے درمیان فاصلے ختم ہوتے جائیں گے(٦٧).

۴.مسلمانوں کا آپس میں ملاپ، اسلامی دنیا کے مسائل پر غور اور ان کا حل تلاش کرنا

آپ کی نظر میں، حج ایک اچھا موقع ہے تا کہ مسلمان بھائی ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کے اور اسلامی دنیا کے حالات معلوم کریں اور اپنے تجربیات، اپنی امنگیں، اپنے حاصل کیے ہوئے نتائج اور اپنی توانائیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کریں(٦٨).اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو میں ''امت مسلمہ'' کے مسائل اور اسلامی دنیا کے بارے میں واحد نظریہ اختیار کرنے کو زیر بحث لایا جائے اور اپنی سوچ وفکر کو جغرافیائی، نسلی، عقیدتی، پارٹی وغیرہ ...جیسی حدود سے آگے نکالیں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں سوچیں(٦٩).

رہبر معظم انقلاب کی نظر میں حج کے موقع پر اسلامی دنیا کی مشکلات کی چارہ جوئی کے لئے سوچنا چاہئے.ایسی مشکلات جن کی وجہ سے مسلمان اقوام اور مسلمان ممالک، جدید علوم میں پیچھے رہ گئے ہیں، خود اپنے ہی مالی منابع کو استعمال نہیں کر سکتے، دنیا کی بڑی ثقافتی دوڑ میں، اجنبی ثقافتوں سے مغلوب ہو گئے ہیں، بین الاقوامی سیاست میں دوسروں کے تابع اور عسکری لحاظ سے عام طور پر سامراجی طاقتوں کی طرف سے حملوں کی زد میں ہیں(٧٠).

ان مشکلات میں سے اہم مشکلات جو رہبر معظم انقلاب کی نظر میں اسلامی دنیا کے سیاسی اور دینی رہنماؤں کی ہمت اور آزادگی کے ذریعہ قابل علاج ہیں، حسب ذیل ہیں:

۱.فرقہ وارانہ اختلافات جن کو علمائے سوء زیادہ ہوا دیتے ہیں اور ان کی ترویج اور تشدید ہوتی ہے.

۲.حد سے زیادہ قوم پرستی کی وجہ سے اٹھنے والے نسلی اور قومی اختلافات جن کو دشمن سے ناطہ رکھنے والے روشن

خیال افراد بھڑکاتے ہیں.

۳.مداخلت کرنے والی طاقتوں کے سامنے جھک جانا جنہوں نے بعض ممالک کو بڑی طاقتوں کی کالونیاں بنا رکھا ہے.

۴.مغرب کی فاسد ثقافت کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا بلکہ سیاسی یا اعتقادی مقاصد کے لئے اس کی تبلیغ اور ترویج کرنا.

۵.بعض حکومتوں کی طرف سے اپنے عوام، ان کے ارادوں، ان کے عقائد اور ان کی ضروریات کو نظر انداز کر دینا اور ان کے بجائے اپنے عزائم کو آگے بڑھانا.

۶.اسلامی دنیا کی بہت سی سیاسی اور ثقافتی شخصیات کا دنیا پر مسلط طاقتوں خاص طور پر امریکہ سے مرعوب ہو جانا.

۷.اسلامی سرزمینوں کے مرکز میں صہیونی غاصب حکومت کا وجود جو بہت سی دوسری مشکلات کا باعث ہے.

۸.دین سے سیاست کی جدائی کی ترویج کرنا اور اسلام کو ایک فردی تجربہ کے طور پر پیش کرنا جس کا زندگی کے دیگر مسائل من جملہ حکومت، سیاست اور اقتصاد سے کوئی تعلق نہیں ہے(۷۱).

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای، حقیقی ابراہیمی حج کو مشکلات کے حل کے لیے شفا بخش نسخہ سمجھتے ہیں(۷۲).

البتہ آپ نے اور بھی بہت سی قابل عمل تجاویز پیش فرمائی ہیں کہ ابراہیمی حج سے اسلامی دنیا کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے کیسے استفادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن بہت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک ان پر عمل نہیں ہوا ہے. انہی میں سے ایک یہ ہے کہ حج کے موقع پر ایک عظیم اور عوامی اجتماع تشکیل دیا جائے جو مختلف اقوام کے برجستہ افراد پر مشتمل ہو اور ایک ایسی پارلیمنٹ بنائی جائے جو کئی ہزار افراد سے تشکیل پاتی ہو، تا کہ اس کی طرف سے طے شدہ فیصلوں کو حاجیوں کے سامنے رکھا جائے اور وہ بھی ان فیصلوں کی تائید کریں، اور اس کے بعد ان فیصلوں کا اجراء کرنے کے لئے، اسلامی حکومتوں اور اقوام کو بھیجا جائے(۷۳). رہبر معظم انقلاب کی نظر میں اب جبکہ اس تجویز پر عمل نہیں کیا جا رہا، کم از کم قوموں کا یہ فرض بنتا ہے کہ اسلام کے منافع اور مصالح سے وابستگی کا اظہار کریں اور اپنے درمیان اتحاد رکھتے ہوئے، اسلام کے دشمنوں سے برائت و بیزاری کا اظہار کریں(۷۴).

۵.دشمن کی پہچان اور اس کا مقابلہ

رہبر معظم انقلاب کا عقیدہ یہ ہے کہ آج اسلام اور مسلمانوں کا دشمن جو ہر قسم کے مالی، سیاسی، تبلیغاتی، قسم قسم کے

نفوذ اور جنگی حربوں سے لیس ہے(۷۵)، اسلامی انقلاب کے ذریعہ پیدا ہونے والی اسلامی بیداری، سے حساس ہوا ہے اور اس کی وجہ سے خطرہ محسوس کر رہا ہے، اسی وجہ سے اسلامی بیداری کے ساتھ ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں بہت گہری اور منظّم طور پر دشمنی کر رہا ہے. آپ فرماتے ہیں:

''جو چیز سامراج کے لئے اہمیت رکھتی ہے وہ ''اسلام'' ہے...ان کے لئے شیعہ یا سنی ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے. جس قوم، جس معاشرے اور جس شخص کا بھی اسلام کے ساتھ زیادہ لگاؤ ہوگا، ان کو اس شخص سے زیادہ خطرہ لاحق ہوگا....سامراج فلسطین میں تنظیم ''حماس'' کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس نگاہ سے لبنان میں ''حزب اللہ'' کو....اب کیا یہ معقول ہوگا کہ ہم اپنے درمیان ایک دوسرے کو قبیلے، قوم یا مذہب کی نگاہ سے دیکھیں؟...ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرتے رہیں اور یہ بھلا دیں کہ ہمارے مشترکہ دشمن کا مقصد یہی ہے کہ ہمیں نابود کر دے؟...''(۷۶) آپ کی نظر میں سامراج کی اسلام سے دشمنی کی وجہ یہی ہے کہ اسلامی ممالک کا مجموعہ مغرب کے سامنے کہیں متمول اور طاقتور بن کر نہ ابھرنے پائے (۷۷).

۶. اسلامی دنیا کے اہم افراد کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا

اگرچہ اسلام دشمن عناصر سے مقابلہ کرنے کے لئے مسلمان اقوام اور حکومتوں کی اپنی اپنی ذمہ داریاں ہیں، لیکن واضح ہے کہ اسلامی دنیا کے برجستہ اور اہم افراد (علماء، روشن خیال، مؤلف، اخبار نویس، آرٹسٹ، سماج پر اثر انداز لوگ...) کی ذمہ داری دوسروں سے کہیں زیادہ ہے. اگر یہ لوگ اپنی ذمہ داریوں کو بہترین طریقہ سے نبھائیں تو قوموں کو اپنے ہمراہ کر سکتے ہیں اور اگر حکومتیں نہ بھی چاہتی ہوں، جب بھی اپنے عوام کی سو فیصد مخالفت نہیں کر سکتیں.

رہبر معظم انقلاب کی نظر میں ان برجستہ افراد کی اہم ذمہ داریاں حسب ذیل ہیں:

۱. اسلامی دنیا کے مسائل کے بارے میں بحث و گفتگو کرنا اور امت مسلمہ کی مشکلات کے بارے میں چارہ جوئی کرنا (۷۸).

۲. عقیدتی اور نسلی اختلافات کو کم کر کے، اسلامی دنیا کے اتحاد کی کوشش کرنا (۷۹).

۳. اسلام کے دشمنوں کی سیاستوں کی تشریح کرنا اور ان کے منصوبوں سے امت مسلمہ کو آگاہ کرنا (۸۰).

۴. عملی اور نظری میدانوں میں اسلام کی تجدید حیات کے لئے مسلمانوں میں خود اعتمادی کو بڑھانا اور بڑی طاقتوں کے سامنے ڈٹ جانے کے لئے تشویق دلانا (۸۱).

رہبر معظم انقلاب کی نظر میں حج کا موقع، ان نمایاں افراد کے لیے اچھا موقع ہے تا کہ مذکورہ فرائض سے ایک دوسرے کو آگاہ کریں اور ان کو بہتر طریقہ سے مکمل کرنے اور اپنے مثبت تجربوں کو دوسروں تک منتقل کرنے کے سلسلے میں بحث اور گفتگو کریں.

ب) اسلامی کانفرنس کے امکانات سے استفادہ.

۱۹۷۲ء میں اسلامی کانفرنس کو تشکیل دینے کا مقصد (۸۲)، اسلامی ممالک میں مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی امور، نسلی برتری اور استعماریت کا خاتمہ اور مل جل کر فلسطینی عوام کی حمایت کرنا تھا (۸۳). لیکن افسوس، مختلف وجوہات کی بنا پر یہ کانفرنس اپنے طے شدہ مقاصد کو مناسب طور پر عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہی.

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے ۱۳۷۶ ہجری شمسی کو تہران میں منعقد ہونے والے، اسلامی کانفرنس کے آٹھویں اجلاس میں اسلامی کانفرنس کو مسلمان ممالک کے حقیقی اتحاد کا مظہر قرار دیا اور اس کانفرنس کے امکانات کو بہتر طور پر بروئے کار لاتے ہوئے شرکاء کو اس کے امکانات سے بہتر طور پر فائدہ حاصل کرنے کے لئے کئی تجاویز بھی پیش فرمائیں:

''یہ کانفرنس، مسلمان ممالک کے مشترک مسائل اور منافع میں حقیقی اتحاد کا مظہر ہوسکتی ہے. اپنے ممبروں کے نام پر بات کرسکتی ہے، مطالبات یا اقدامات کرسکتی ہے اور ان کی مالی اور سیاسی طاقت پر بھروسہ کرسکتی ہے. اپنے ارکان کے درمیان مشکلات کو حل کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے. جہاں کہیں بھی کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے لئے یا واحد مقصد کو پانے کے لئے تمام کوششوں اور امداد کو مرکزیت دینے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ان میں یکجہتی اور ہماہنگی پیدا کرنے کا کام کرسکتی ہے، اور وہی مرکز بن سکتی ہے. جہاں پر ضروری ہو، قضاوت کرے اور جہاں فائدہ مند ہو وہاں پر وعظ کرے. آج اسلامی دنیا کا عالمی تجارت میں بیس فیصد سے بھی کم حصہ ہے (آبادی کے لحاظ سے بھی یہی تناسب ہے) لیکن مذکورہ مقدار میں سے اسلامی ممالک کی آپس میں تجارت، اس سے بھی کہیں کم ہے. یہ کانفرنس اس مؤثر اقتصادی مسئلہ میں جو اس مجموعہ پر سیاسی طور پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے، اپنا فعال کردار ادا کرسکتی ہے'' (۸۴).

رہبر معظم انقلاب نے تجویز پیش فرمائی ہے کہ خاص کمیٹیاں تشکیل دی جائیں تا کہ نیچے دی گئی تجاویز پر عمل کیا جا سکے:

۱. اسلامی ممالک کے درمیان بین المجالس پارلیمنٹ تشکیل دی جائے.

۲.اسلامی مشترکہ بازار بنایا جائے

۳.اسلامی قضاوت کے محکمہ کو تشکیل دیا جائے.

۴.پچپن اسلامی ممالک کی نمایندگی کے لئے، اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں دائمی سیٹ کے طور پر ''ویٹو'' کا حق حاصل کیا جائے، البتہ اس وقت تک، جب تک ''ویٹو'' کا قانون موجود ہے.

۵.اسلامی کانفرنس کے ممبر ممالک میں سے اگر کسی پر اجنبیوں کی طرف سے حملہ ہوتا ہے تو اس کا دفاع کرنے کے لئے کوئی نظام تیار کیا جائے.

۶.اسلامی ممالک میں سے صلح وامن کی پاسبانی کے لئے ایک محافظ فوج تیار کی جائے تا کہ اجنبی ممالک صلح اور امن کی حفاظت کے بہانے سے اسلامی ممالک میں مداخلت نہ کرسکیں.

اسی طرح اس کانفرنس میں پاس ہونے والی قراردادوں کی مکمل پابندی اور اجراء کا مطالبہ فرمایا تا کہ اس قسم کے اجلاسوں کا مختلف اسلامی اقوام کے لئے کوئی نتیجہ برآمد ہوسکے (۸۵).

ج) فلسطین

اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت آیۃ اللہ العظمی امام خمینیؒ کی طرح، رہبر انقلاب، حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای بھی فلسطین کو اسلامی دنیا کے درمیان اتحاد کا مرکزی عنصر اور محور سمجھتے ہیں. آپ کا عقیدہ یہی ہے کہ اس سرزمین کو بہت ہی پیچیدہ اور ہمہ جہت سازش کے ذریعہ غصب کیا گیا ہے تا کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کو روکا جاسکے اور اس طرح دوبارہ کوئی طاقتور مسلمان حکومت تشکیل نہ ہونے پائے (۸۶).

لیکن اتحاد کا یہ عامل بھی اسلام دشمنوں کے ناپاک عزائم کی زد سے دور نہ رہ سکا اور انہوں نے بعض اسلامی ممالک کو مذاکرات کی میز پر بلا کر اور نتیجے میں ان کے ذریعہ اسرائیل کو قانونی طور پر ایک ملک کی حیثیت دلا کر، صہیونیزم کے خلاف تشکیل پانے والے اسلامی محاذ میں دراڑیں ڈال دیں (۸۷). حالانکہ آپ کی نظر میں اسلامی دنیا کی تقدیرات کا دارومدار، فلسطین کی تقدیر سے جڑا ہوا ہے، یعنی اس جنگ میں فلسطین کی کامیابی، پوری دنیائے اسلام کی کامیابی ہوگی اور اس کی شکست، پوری اسلامی دنیا کی شکست ہوگی (۸۸).

د) حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رہبر انقلاب کی نظر میں مسلمانوں کا تعلق کسی بھی فرقہ یا مذہب سے ہو، لیکن وہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا احترام ضرور کرتے ہیں اور آپؐ سے محبت رکھتے ہیں اور یہ محبت اور عشق اگر معرفت کے ساتھ ہو تو، نہ

صرف امت مسلمہ کو کمال کی طرف لے جانے کی ضمانت دے سکتا ہے بلکہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا عامل بھی بن سکتا ہے(۸۹). رہبر انقلاب کی نظر میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت پر مغرب کی طرف سے اس آخری صحافتی اور ثقافتی یلغار کی اصلی وجہ یہی ہے کہ آپ کو امت مسلمہ کے اتحاد کی راہ میں میں مرکزی مقام حاصل ہے اور وہ اس نقطہ اتحاد کو بے اعتبار اور ختم کرنا چاہتے ہیں. اسی وجہ سے بہت ضروری ہے کہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو مختلف پہلوں اور زاویوں سے پہچنوایا جائے تا کہ ان کی اس قسم کی سازشیں ناکام ہو جائیں(۹۰).

ھ) امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی امامت اور جانشینی کا مسئلہ بہت قدیم ایام سے اب تک، شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اختلافات کا اصلی سبب بنا رہا ہے. لہذا حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای، شیعہ اور اہل سنت دونوں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کو آپس میں اختلافات کا سبب قرار دینے کی بجائے، انھیں نقطہ اتحاد قرار دیں اور اختلافی مسائل کو منطق و استدلال کے ساتھ مذاکرات و گفتگو سے حل کیا جانا چاہئے(۹۱).

و) اہل بیت علیہم السلام

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ نے اہل بیت علیہم السلام کو اسلام کے سب سے اہم اور سب سے بڑے مسائل میں سے شمار فرماتے ہیں اور زور دیتے ہیں کہ اہل بیت علیہم السلام سے محبت، صرف شیعوں سے ہی مخصوص نہیں ہے اور دنیا بھر کے مسلمان، چاہے کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، اہل بیت علیہم السلام کی محبت دل میں رکھتے ہیں(۹۲). لہذا اہل بیت علیہم السلام کی محبت بھی مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا عامل بن سکتی ہے. کیونکہ حدیث ثقلین کے مطابق (جس کو شیعہ اور اہل سنت کے راویوں نے نقل کیا ہے) اہل بیت علیہم السلام، دین کی معرفت اور شناخت کے منابع اور قرآن کریم کے برابر شمار کیے گئے ہیں، لہذا آج اسلامی دنیا کو اس بات کی ضرورت ہے کہ مکتب اہل بیت علیہم السلام کے حقائق اور معارف سے آگاہی حاصل کرے کہ وہ خود دنیا کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا ایک عامل ہیں.

ز) عید فطر

عید فطر ایسی عیدوں میں سے ہے جس کو پوری اسلامی دنیا بہت ہی عقیدت اور احترام سے مناتی ہے اور رہبر

انقلاب کی نظر میں، یہ عید ایک تو بین الاقوامی رسم ہے، دوسرے یہ کہ اس کا معنوی پہلو بہت واضح اور نمایاں ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اس الٰہی تحفہ سے بہترین طور پر استفادہ کریں، آپ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''...اس عظیم ذخیرے سے، مسلمانوں کو دو فائدے اٹھانے چاہئیں: پہلا فائدہ، مسلمانوں کا آپس میں اتحاد اور قربتیں ہیں اور دوسرا فائدہ اسلامی دنیا کا معنویت کی طرف متوجہ رہنا ہے...آج اسلام کی معنویت، اسلام کی حقیقت اور دین کی روحانیت کی طرف پلٹنا، مسلمانوں کا اصلی نعرہ ہونا چاہئے. یہ آج مسلمانوں کی ضرورت ہے''(۹۳).

ح) اسلامی اتحاد کا منشور

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای نے بیسویں بین الاقوامی اتحاد کانفرنس کے مہمانوں سے تفرقہ انگیز حوادث کو روکنے کے لئے، علماء اسلام اور روشن خیال افراد سے درخواست کی کہ ''اسلامی اتحاد کا منشور'' تیار کیا جائے تا کہ کوئی بھی نادان، متعصب فرد جو کسی بھی اسلامی فرقے سے تعلق رکھتا ہے، آزادانہ طور پر مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ پر اسلام سے خارج ہونے کی تہمت نہ لگا سکے؛ یا ان کے کافر ہونے کا فتوا نہ دے سکے(۹۴).

رہبر انقلاب کی اسلامی اتحاد کا منشور تیار کرنے کی تجویز کے بعد، ''تقریب بین المذاہب اسلامی کی عالمی کانفرنس'' نے اسلامی اتحاد کے منشور کا مسودہ تیار کرتے ہوئے، اسلامی اتحاد کے اکیسویں بین الاقوامی اجلاس کا موضوع ہی ''اسلامی اتحاد کا منشور، تنقید، نئے جائزے'' رکھا جو ۱۳۸۷ ہجری شمسی کو تہران میں منعقد ہوا. اس اجلاس میں اسلامی دنیا کے کونے کونے سے اکٹھا ہونے والے علماء اور دانشوروں نے مذکورہ مسودہ پر سیر حاصل بحث اور تبادلہ خیال کرتے ہوئے اس کی اجمالی طور پر تائید کی. اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ تقریب مذاہب اسلامی کے دفتر کی طرف سے خاص کمیٹی تشکیل دی جائے جو مختلف مذاہب کے علماء اور دانشوروں پر مشتمل ہو، تا کہ اس مسودہ میں کی جانے والی ہر قسم کی اصلاحات اور اس سلسلے میں دی جانے والی تجاویز کی تحقیق کرتے ہوئے، اس کا حتمی مسودہ تیار کرے اور اسلامی دنیا کے علماء اور صاحب نظر افراد سے اس کی تائید میں دستخط لیے جائیں.

تفرقہ کی وجوہات اور عوامل

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کی نظر میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے میں متعدد عوامل دخیل ہیں، اس تحریر میں ان عوامل میں سے اہم ترین عوامل کو ذکر کیا جا رہا ہے:

الف)اسلام کے دشمن

رہبر انقلاب حضرت آیۃ اللہ العظمی خامنہ ای کی نظر میں اسلام کے دشمنوں نے بہت قدیم زمانہ سے آج تک اپنی پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کے اتحاد اور انسجام کو توڑا جائے اور ان کے درمیان تفرقہ ڈالا جائے (۹۵). کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ اسلام، جس کی جمعیت، دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے، اور دنیا کے حساس ترین علاقہ جو اسلامی ممالک کا محل وقوع ہے اس کے ہاتھ میں ہے اور ساتھ ہی عظیم ثروت اور ذخائر سے مالا مال ہوتے ہوئے، گہرے، اصیل اور قدیم علمی اور معنوی ورثہ کا حامل ہے، جو بالقوہ طور پر اپنے وسائل اور امکانات کو بروئے کار لا کر ایک مقتدر، مالدار اور مستقل مجموعہ کو تشکیل دے سکتا ہے. اور آج عالمی سامراج کے لئے ایک مالدار، طاقتور اور مستقل مجموعہ ہرگز قابل برداشت نہیں ہے (۹۶).

آپ اسلامی انقلاب کی کامیابی کو، اسلام کے دشمنوں کی طرف سے اپنے تفرقہ انگیز اقدامات میں تیزی لانے کا باعث سمجھتے ہیں، کیونکہ اسلامی انقلاب کی طرف سے مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دینے کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں نے اسلامی انقلاب کی طرف رغبت دکھائی. اسلامی انقلاب کی دن بدن بڑھتی ہوئی جاذبیت، امریکہ اور سامراج کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی تا کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پھیلانے پر خرچ کیے ہوئے اپنے سرمایوں کو تلف ہونے سے بچائیں، لہذا انھوں نے اس سلسلے میں اپنی کوششوں کو مزید تیز کر دیا (۹۷). اسی طرح رہبر انقلاب کی نظر میں امریکہ کی قیادت میں مغرب کی طرف سے مشرق وسطیٰ پر حملہ اور دہشت گردی سے مقابلہ کرنے کا بہانہ یا ''عظیم مشرق وسطیٰ'' کے منصوبوں کے اجراء کا سامراجی منافع کو حاصل کرنے کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے (۹۸).

اسلامی دنیا کے دشمنوں نے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈال کر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے آزمائے ہیں اور اب بھی ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، آپ کی نظر میں ان میں سے اہم طریقے حسب ذیل ہیں:

۱.فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینا (۹۹).

۲.اسرائیل کی جعلی حکومت قائم اور مضبوط کرنا اور اس کی حمایت کرنا (۱۰۰).

۳.جعلی مذاہب کی تشکیل (۱۰۱).

۴.اسلامی ممالک میں بے اعتمادی کی فضا قائم کرنا (۱۰۲).

۵.حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو سبوتاژ کرنا (۱۰۳).

ب) شدت پسند قوم پرستی

رہبر انقلاب کی نظر میں گزشتہ صدی میں مسلمان اقوام کے ایک دوسرے سے الگ ہو جانے اور دشمنوں کے ان پر مسلط ہو جانے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان میں شدت پسندی اور حد سے زیادہ قوم پرستی کی ترویج کی گئی ہے (۱۰۴).

ج) لاعلمی اور غلط فہمی

اگر مسلمان، ایک دوسرے کے مذاہب کے بارے میں صحیح اور واقعیت پر مبنی معلومات نہ رکھتے ہوں اور صرف شایعات اور توہمات کی بنا پر ایک دوسرے کے بارے میں قضاوت کریں گے، تو ان کے درمیان عداوت بڑھے گی اور اسی نسبت سے ان کے اتحاد میں کمی آئے گی (۱۰۵) لہذا یہ اسلامی دنیا کے علماء اور روشن خیال طبقہ کا فرض بنتا ہے کہ حقائق کو واضح طور پر بیان کر کے، اپنی قوموں کو غلط فہمیوں اور لاعلمی کی دنیا سے باہر نکالیں اور اسلامی دنیا کے حقائق سے لوگوں کو روشناس کرائیں.

نتیجہ

اتحاد کے موضوع پر حضرت امام خمینیؒ اور حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای کے آراء اور نظریات پر غور کرنے سے یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ اس سلسلے میں آپ دونوں حضرات کے نظریات، مشابہ اصول کی پیروی کرتے ہیں اور ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے. امید یہ ہے کہ مذکورہ نصائح اور ساتھ ہی دوسرے اسلامی ممالک کے صاحب فکر حضرات کے اتحاد پسندانہ نظریات، کی وجہ سے اس وادی میں عملی قدم اٹھانے میں مدد مل سکے. جس کی اسلامی ممالک کے سربراہوں، دانشوروں، اہل فن اور خلاصہ یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے تمام مخلص افراد کی طرف سے توقع کی جا رہی ہے. کیونکہ جو چیز آج تک مسلمانوں کے اتحاد میں حائل بنی رہی ہے، وہ فکری خلاء یا طریقہ کار سے لاعلمی نہیں تھی، بلکہ عام مسلمانوں اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے سربراہوں کی طرف سے اس سلسلہ میں سنجیدگی کا فقدان اور ان میں سے بعض کی طرف سے اس عظیم اور حیاتی مسئلہ کو نظر انداز کیا جانا تھا.

حوالے:

۱ . ”أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيّاً وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُون“ (زخرف/۳۲)

۲ . ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ“ (حجرات/۱۳)

۳. ”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُواْ فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلاَّ الَّذِيْنَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاء تْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْياً بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّهُ الَّذِيْنَ آمَنُواْ لِمَا اخْتَلَفُواْ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللّهُ يَهْدِيْ مَن يَشَاء ُإِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيم“ (بقره/۲۱۳)، ”وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلاَّ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُواْ وَلَوْلاَ كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُون“ (یونس/۱۹)، ”وَآتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاء هُمُ الْعِلْمُ بَغْيَاً بَيْنَهُمْ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْمَا كَانُوا فِيْهِ يَخْتَلِفُون“ (جاثیه/۱۷)

۴.طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ترجمہ سید محمد باقر موسوی ہمدانی، ج۲، (قم، دفتر انتشارات اسلامی، جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، پانچویں طبع ۱۳۷۴ھ ش)، ص۱۶۸.

۵ . ”إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُونَ بِاللّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيْدُونَ أَن يُفَرِّقُواْ بَيْنَ اللّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيْدُونَ أَن يَتَّخِذُواْ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيْلاً☆ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقّاً وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ عَذَاباً مُّهِيْنا“ (نساء/۱۵۱،۱۵۰)

۶ . ”إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُون“ (انبیاء/۹۲)، ”وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُون“ (مؤمنون/۵۲)، ”وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ“ (انفال/۶۳)

۷. ”وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيْعاً وَلاَ تَفَرَّقُواْ وَاذْكُرُواْ نِعْمَتَ اللّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاء فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً وَكُنتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُون“ (آل عمران/۱۰۳)

۸.مطہری، مرتضی، حماسہ حسینی، ج۲،، (تہران، انتشارات صدرا، پندرھویں طبع ۱۳۷۱ھ ش)، ص۴۹.

۹ . ” وَأَطِيْعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَلاَ تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُواْ وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُواْ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِيْن“ (انفال/۴۶)

۱۰ . ”وَأَنَّ هَـذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْماً فَاتَّبِعُوہُ وَلاَ تَتَّبِعُواْ السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَن سَبِیْلِہِ ذَلِکُمْ وَصَّاکُم بِہِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُون“ (انعام/۱۵۳)، ”شَرَعَ لَکُم مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصَّی بِہِ نُوحاً وَالَّذِیْ أَوْحَیْنَا إِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہِ إِبْرَاھِیْمَ وَمُوسَی وَعِیْسَی أَنْ أَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِیْہِ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوھُمْ إِلَیْہِ اللَّہُ یَجْتَبِیْ إِلَیْہِ مَن یَشَاء ُوَیَھْدِیْ إِلَیْہِ مَن یُنِیْب“ (شوریٰ/۱۳)

۱۱ . ”کَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّہُ النَّبِیِّیْنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنذِرِیْنَ وَأَنزَلَ مَعَھُمُ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُواْ فِیْہِ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ إِلاَّ الَّذِیْنَ أُوتُوہُ مِن بَعْدِ مَا جَاء تْھُمُ الْبَیِّنَاتُ بَغْیاً بَیْنَھُمْ فَھَدَی اللّہُ الَّذِیْنَ آمَنُواْ لِمَا اخْتَلَفُواْ فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِہِ وَاللّہُ یَھْدِیْ مَن یَشَاء ُإِلَی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ“ (بقرہ/۲۱۳)

۱۲ . ”وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوَی☆إِنْ ھُوَ إِلَّا وَحْیٌ یُوحَی“ (نجم/۳،۴)

۱۳ . ”مَّنْ یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّہَ وَمَن تَوَلَّی فَمَا أَرْسَلْنَاکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظاً“ (نساء/۸۰)

۱۴ . ”وَیَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّہِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلَّی فَرِیْقٌ مِّنْھُم مِّن بَعْدِ ذَلِکَ وَمَا أُوْلَئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ☆ وَإِذَا دُعُوا إِلَی اللَّہِ وَرَسُولِہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ إِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُم مُّعْرِضُون“ (نور/۴۸،۴۷)

۱۵ . ”یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ أَطِیْعُواْ اللّہَ وَأَطِیْعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِیْ الأَمْرِ مِنکُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوہُ إِلَی اللّہِ وَالرَّسُولِ إِن کُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ ذَلِکَ خَیْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِیْلا“ (نساء/۵۹)

۱۶ . ”لَقَدْ جَاء کُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُم بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوفٌ رَّحِیْم“ (توبہ/۱۲۸)

۱۷ . ”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَیْنَ أَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللَّہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُونَ“ (حجرات/۱۰)

۱۸.طباطبائی،سید محمد حسین،سابقہ حوالہ،ج۹،ص۲۱۲)

۱۹ . ”إِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ أَن یُوقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاء فِیْ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَن ذِکْرِ اللّہِ وَعَنِ الصَّلاَةِ فَھَلْ أَنتُم مُّنتَھُون“ (مائدہ/۹۱)

۲۰.جعفریان،رسول،تاریخ سیاسی اسلام،ج۲،(تہران،انتشارات وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی،دوسری طبع،۱۳۶۹ھ.ش)ص۱۵۹۔۱۵۷.عقد اخوت کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے لئے دیکھئے: ہدایت پناہ،محمد رضا،حدیث برادری در سیرہ نبوی،(قم،بوستان کتاب،پہلی طبع،۱۳۸۳ھ.ش)

۲۱. ابوزہرہ،محمد،خاتم پیامبران،ج۲،ترجمہ حسین صابری،(مشہد: بنیاد پژوہشہای اسلامی آستان قدس رضوی،پہلی

طبع ۱۳۷۳ھ.ش)،ص۲۷۳،۲۶۸)
۲۲.امام خمینیؒ، اتحاد از دیدگاہ امام خمینیؒ، (تہران، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار حضرت امام خمینیؒ، پہلی طبع، ۱۳۷۶ھ.ش)،ص ۹۔۱۳.
۲۳.امام خمینیؒ، صحیفہ نور، ج۱، (تہران، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، ۱۳۷۰ھ.ش)ص۸۴.
۲۴.سابقہ حوالہ،ص۸۷۔۸۳.
۲۵.سابقہ حوالہ،ص۱۴۹،۱۱۱.
۲۶.امام خمینیؒ، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار حضرت امام خمینیؒ، تہران، پہلی طبع، ۱۳۷۸ھ.ش) ج۸،ص۳۰۸.
۲۷.سابقہ حوالہ، ج۹،ص۱۳۰.
۲۸.امام خمینیؒ، سیاسی۔الٰہی وصیت نامہ، (مشہد، انتشارات کتابخانہ مرکزی آستان قدس رضوی، ۱۳۶۹ھ.ش)،ص۲.
۲۹.امام خمینیؒ، صحیفہ امام، سابقہ حوالہ، ج۲،ص۱۹۹.
۳۰.سابقہ حوالہ، ج۳،ص۲.
۳۱.سابقہ حوالہ، ج۹،ص۲۶۷.
۳۲.سابقہ حوالہ، ج۲۱،ص۷۷.
۳۳.سابقہ حوالہ، ج۱۹،ص۳۴۰.
۳۴.سابقہ حوالہ، ج۱۰،ص۱۵۹اور ج۱۹،ص۲۱.
۳۵.سابقہ حوالہ، ج۱۹،ص۲۸.
۳۶.سابقہ حوالہ، ج۲۰،ص۳۱۶.
۳۷.سابقہ حوالہ، ج۲۱،ص۷۸.
۳۸.امام خمینیؒ، اتحاد از دیدگاہ امام خمینیؒ، سابقہ،ص۲۱۳.
۳۹.حشمت زادہ، محمد باقر، تاثیر انقلاب اسلامی ایران بر کشورہای اسلامی، پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشہ اسلامی، تہران، اول، ۱۳۸۵ھ.ش،ص۵۶.
۴۰.امام خمینیؒ، صحیفہ امام، ج۲۱،ص۸۲.
۴۱.سابقہ حوالہ، ج۱۱،ص۱۰۵.
۴۲.امام خمینیؒ، وصیت نامہ،ص۵.
۴۳.وصیت نامہ امام خمینیؒ، سابقہ،

۴۴.امام خمینیؒ، صحیفہ امام، سابقہ، ج۱، ص۳۷۶۔۳۷۴.

۴۵.دیکھئے، امام خمینیؒ، قومیت وملیت واندیشہ فراملی از دیدگاہ امام خمینی، (تہران، مؤسسہ تنظیم ونسر آثار حضرت امام خمینیؒ، اول، ۱۳۸۱ھ.ش).

۴۶.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، ''حدیث ولایت'' سافٹ ویئر سی ڈی، مؤسسہ پژوہش فرہنگی انقلاب اسلامی، دوسرا ایڈیشن، عید فطر کے موقع پر، حکومتی اراکین سے خطاب، ۱۳۷۹ھ.ش

۴۷.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج کے لیے پیغام ۱۳۸۴ھ.ش

۴۸.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اسلامی ممالک کے سفیروں سے ۱۷ ربیع الاول (عید میلاد النبی) کی مناسبت سے خطاب، ۱۳۸۴ھ.ش

۴۹.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اسلامی ممالک کے سفیروں سے عید فطر کی مناسبت سے خطاب، ۱۳۸۰ھ.ش

۵۰.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اسلامی ممالک کے سفیروں سے عید فطر کی مناسبت سے خطاب ۱۳۸۲ھ.ش

۵۱.سابقہ حوالہ

۵۲.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، ائمہ جمعہ کی تجدید بیعت میں خطاب، ۱۳۸۶ھ.ش.

۵۳.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اتحاد اسلامی کانفرانس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۵۷ھ.ش.

۵۴.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، تقریب بین المذاہب الاسلامیہ کی پہلے اعلیٰ سطحی اجلاس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۷۰ھ.ش.

۵۵.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اہل سنت کے علماء، ائمہ جمعہ اور دینی مدارس کے اساتید کے ساتھ ملاقات میں خطاب، ۱۳۶۸ھ.ش.

۵۶.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، افغانستان کی حزب اتحاد اسلامی سے ملاقات میں خطاب، ۱۳۶۹ھ.ش.

۵۷.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۷ھ.ش.

۵۸.سابقہ حوالہ.

۵۹.سابقہ حوالہ.

۶۰.سابقہ حوالہ.

۶۱.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۲ھ.ش.
۶۲.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۰ھ.ش.
۶۳.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۳ھ.ش.
۶۴.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۸۳ھ.ش.
۶۵.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجۃ الاسلام والمسلمین محمدی ری شہری اور دیگر حج کے امور میں فعال کارکنوں سے ملاقات میں خطاب، ۱۳۷۶ھ.ش.
۶۶.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۰ھ.ش.
۶۷.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۲ھ.ش.
۶۸.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۳ھ.ش.
۶۹.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۵ھ.ش.
۷۰.سابقہ حوالہ.
۷۱.سابقہ حوالہ.
۷۲.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حج کے امور میں فعال کارکنوں سے ملاقات میں خطاب، ۱۳۷۳ھ.ش.
۷۳.سابقہ حوالہ.
۷۴.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اتحاد اسلامی کانفرانس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۷۴ھ.ش.
۷۵. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، آپ کے آثار کو محفوظ اور نشر کرنے والے ادارے کا سائٹ؛ www.khamenei.ir، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے خطاب، ۱۳۸۶ھ.ش.
۷۶.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، ''حدیث ولایت'' سافٹ ویئر سی ڈی، مؤسسہ پژوہش فرہنگی انقلاب اسلامی، دوسرا ایڈیشن، عید فطر کے موقع پر، حکومتی اراکین اور اسلامی ممالک کے سفیروں سے خطاب، ۱۳۸۳ھ.ش
۷۷.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۳ھ.ش.
۷۸.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۸۴ھ.ش.
۷۹.سابقہ حوالہ
۸۰.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حکومتی اراکین اور اسلامی ممالک کے سفیروں سے خطاب، ۱۳۸۴ھ.ش
۸۱.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حجاج بیت اللہ کے لئے پیغام، ۱۳۷۳ھ.ش.

۸۲. اسلامی کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۹۶۹ء کو مغرب کے دارالخلافہ میں تشکیل ہوا اور اس کانفرنس کے منشور کو، شریک حکومتوں کی اکثریت کی موافقت سے، ۱۹۷۲ء کو جدہ میں ہونے والے وزرائے امور خارجہ کے تیسرے اجلاس میں پاس کیا گیا.(دیکھئے: اسلامی کانفرنس، وزارت امور خارجہ، تہران، دوسری طبع، ۱۳۷۵ھ.ش)

۸۳. علی آقا بخشی، مینو افشاری راد، فرہنگ علوم سیاسی، (تہران، چاپار، طبع اول، ۱۳۸۳ھ.ش)، ص ۴۸۰.

۸۴. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی ممالک کے سربراہاں کے اجلاس کی افتتاحی تقریب سے خطاب، ۱۳۷۶ھ.ش.

۸۵. سابقہ حوالہ.

۸۶. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، فلسطین کے انتفاضہ سے حمایت کی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب، ۱۳۸۰ھ.ش.

۸۷. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے عید فطر کی مناسبت سے خطاب. ۱۳۷۵ھ.ش

۸۸. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے عید میلاد النبی اور حضرت امام صادق علیہ السلام کی ولادت کی مناسبت سے خطاب. ۱۳۸۱ھ.ش

۸۹. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اتحاد اسلامی کانفرانس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۶۸ھ.ش.

۹۰. سابقہ حوالہ.

۹۱. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، زاہدان کے عوامی اجتماع سے خطاب، ۱۳۸۱ھ.ش.

۹۲. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اہل بیت عالمی کانفرنس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۶۹ھ.ش.

۹۳. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے عید فطر کی مناسبت سے خطاب. ۱۳۷۹ھ.ش

۹۴. سابقہ حوالہ.

۹۵. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اتحاد اسلامی کانفرانس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۶۸ھ.ش.

۹۶. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حکومتی اراکین اور اسلامی ممالک کے سفیروں سے خطاب، ۱۳۸۳ھ.ش

۹۷. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، حضرت امام خمینیؒ کی پہلی برسی میں شریک ہونے والے غیر ملکی مہمانوں سے خطاب، ۱۳۶۹ھ.ش

۹۸. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان اور اتحاد اسلامی کانفرانس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۸۳ھ.ش.

۹۹. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، آپ کے آثار کو محفوظ اور نشر کرنے والے ادارے کا سائٹ؛ www.khamenei.ir، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام کے چوتھے اجلاس میں شریک غیر ملکی مہمانوں سے خطاب،

۱۳۸۶ھ.ش.
۱۰۰.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، ''حدیث ولایت'' سافٹ ویئر سی ڈی، مؤسسہ پژوہش فرہنگی انقلاب اسلامی، دوسرا ایڈیشن، فلسطینی انتفاضہ کی حمایت میں منعقد ہونے والی کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے خطاب، ۱۳۸۰ھ.ش
۱۰۱.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، بسیج (رضا کاروں) سے خطاب، ۱۳۶۸ھ.ش، خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اہل سنت کے علماء، ائمہ جمعہ اور دینی مدارس کے اساتید کے ساتھ ملاقات میں خطاب، ۱۳۶۸ھ.ش، اسلامی کانفرنس میں شریک اراکین سے خطاب، ۱۳۶۸ھ.ش.
۱۰۲. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے عید فطر کی مناسبت سے خطاب. ۱۳۷۵ھ.ش.
۱۰۳.خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے عید میلاد النبی اور حضرت امام صادق علیہ السلام کی ولادت کی مناسبت سے خطاب. ۱۳۷۹ ھ.ش، ملک کے گورنروں کی ملاقات میں خطاب، ۱۳۸۴ھ.ش.
۱۰۴. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، سابقہ، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے عید فطر کی مناسبت سے خطاب. ۱۳۷۵ھ.ش.
۱۰۵. خامنہ ای، آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی، آپ کے آثار کو محفوظ اور نشر کرنے والے ادارے کا سائٹ؛ www.khamenei.ir، اسلامی جمہوریہ ایران کے سربراہان سے ملاقات، ۱۳۸۶ھ.ش.

عزاداری اور تحفظ شریعت

احتشام عباس زیدی

امام حسین علیہ السلام کے جاوداں اور عظیم انقلاب اور شہادت عظمیٰ کو چودہ صدیاں گزر گئیں، اور یہ انقلاب آج بھی اپنی قوت اور تازگی کے ساتھ دنیا کی تمام حق پسند قوموں اور انسانیت وشرافت کی قربانگاہ پر جان چھڑکنے والوں کے لئے مشعل راہ بنا ہوا ہے۔

گزشتہ ہر دور میں اور آج بھی ظلم وستم اور باطل پرست طاقتوں کے خلاف ابھرنے والی ہر آواز کا سب سے مؤثر لہجہ حسینی لہجہ رہا ہے، اس حقیقت کو ہم نے بھی کم سمجھا ہے اور دوسرے تو اس کی شناخت سے محروم ہیں ہی، یہ بات الگ ہے کہ ہمارے عہد میں اس لافانی انقلاب کی محکم عملی صورت اسلامی انقلاب کے شکل میں ظاہر ہوئی جس نے اس عہد میں شرق وغرب کی تمام باطل طاقتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور اس طرح اس نے اپنی بھرپور زندگی او رتوانائی کا ثبوت دیا۔

عزاداری امام حسین علیہ السلام اس جاوداں انقلاب کو بلا کسی تحریف کے انسانی معاشرہ میں باقی رکھنے کے لئے قائم کی گئی، تاکہ اس غم میں بہنے والے آنسوؤں کا سیلاب اک طرف باطل طاقتوں کو لرزہ براندام رکھے تو دوسری طرف انسانی فضائل وکمالات کو حیات دینے والا یہ انقلاب ہر سال نہ صرف انسانوں سے خراج تحسین لیتا رہے بلکہ عزائے شہ میں شریک ہونے والے ہر شخص سے اس بات کی بیعت لیتا رہے کہ ہم حسینؑ کے نام پر دنیا کی ہر برائی اور ہر ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرتے رہیں گے اور دنیا کی ہر نیکی اور حق وانصاف کی حمایت میں ہاتھوں کو بلند کرتے اور آواز اٹھاتے رہیں گے۔

عزاداری درحقیقت شریعت محمدیؐ کے تحفظ کی ضمانت ہے، عزاداری درحقیقت دین خدا اور اسلام پر پابندی سے جمے رہنے کا ہم سے ہر سال عہد لیتی ہے۔ افسوس ہے کہ کچھ دانا دشمنوں اور کچھ نادان دوستوں نے ہمیشہ

یہ کوشش کی ہے کہ عزاداری کو نہ صرف اس کی ظاہری شکل پر ہی باقی رکھیں، بلکہ اس میں ایسی چیزوں کا اضافہ کریں کہ سادہ دل اہل عزا کا دھیان عزاداری کی روح، اس کی اصل اور اس کے لافانی مقصد سے ہٹ جائے، اور عزاداری کی داغ بیل ڈالنے والے ان مظلوموں کا مقصد فوت ہو جائے جنھوں نے اپنے عزیزوں اور اپنی گود کے پالوں کی قربانیاں دے کر اس مشعل انقلاب کو عزائے حسینؑ کی شکل میں یا یوں کہیں کہ دین محمدیؐ کے تحفظ کی ضمانت کی شکل میں آنے والی نسلوں کے حوالہ کیا تھا۔ بعض دانا دشمن ہمارے نادان دوستوں کو اس مغالطہ میں رکھتے ہیں کہ عزاداری الگ شئے ہے اور دین کے ارکان کوئی دوسری چیز ہیں، عزائے حسینؑ الگ چیز ہے اور شریعت محمدیؐ کوئی الگ شئے۔

ہم اس بات کی مزید وضاحت بعد میں کریں گے پہلے یہ دیکھیں کہ خود انقلاب حسینیؑ کہ جس اصل کی فرع یہ عزاداری ہے کن بنیادوں پر وجود میں آیا۔ ایک بار پھر عرض کر دوں کہ انقلاب حسینیؑ کے دو بنیادی پہلو ہیں:

۱۔ شہادت عظمیٰ جو درحقیقت اس انقلاب کی روح ہے اور جس میں کائنات ہستی کی بے مثال شخصیتوں نے ایک عظیم مقصد کے تحفظ کے لئے قربانیاں پیش کیں۔

۲۔ عزاداری حسین علیہ السلام جو شہادت عظمیٰ اور انقلاب حسینؑ کی فرع ہے جس کی بنیاد اس لئے ڈالی گئی کہ جن چیزوں کے تحفظ کے لئے یہ عظیم قربانیاں دی گئی تھیں، انھیں پوری قوت کے ساتھ زندہ رکھا جائے اور ان کی پابندی کی جائے۔ آیئے اب ہم خود اس انقلاب کی اصل شخصیت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں چلتے ہیں اور ان سے عاجزانہ دریافت کرتے ہیں کہ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے اس عظیم انقلاب کی بنیادیں کیا ہیں؟

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ ''انّی لم اَخرُج اشراً و لا بطراً ولا مُفسداً ولا ظالماً و انّما خرجتُ لطلب الاصلاحِ فی امّةِ جدّی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) **اریدُ اَن آمرَ بالمعروفِ و انهیٰ عنِ المنکرِ و اسیرَ بسیرة جدّی و ابی علی بن ابی طالبٍ فمن قبِلَنی بقبولِ الحقِّ فالله اولیٰ بالحقّ و من ردّ علیَّ هذا اصبِرُ حتّی یقضیَ اللّٰه بَینی و بینَ القومِ و هوَ خیرُ الحاکمینَ''**

(مقتل خوارزمی۔ ج۱، ص۱۸۸: مقتل عوالم۔ ص۵۴)

''بلاشبہ میں نے خودسری، عیش کوشی، فساد و ستمگری کے لئے قیام نہیں کیا ہے بلکہ میں

اپنے نانا کی امت میں پیدا ہوجانے والی خرابی کی اصلاح کے لئے اٹھا ہوں ، میں لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلانے ،اور برائیوں سے روکنے کے لئے میدان میں آیا ہوں اور امت پیغمبر کو اپنے جد بزرگوار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے پدر بزرگوار علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی سیرت پر چلانے کے لئے قیام کر رہا ہوں اور جو شخص بھی حق کو قبول کرنے کے لئے میری پیروی کرے گا اس نے اللہ کی راہ اختیار کی اور جس نے میری پیروی سے انکار کیا تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کردے''

اس اہم وصیت نامہ سے جو آپ نے اپنے بھائی محمد ابن حنفیہ کو لکھا تھا چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

الف) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو جس شریعت کی تعلیم دی تھی وہ اسلامی شریعت تھی آپ امت کو اسی کا پابند بنا کے گئے تھے لیکن آپ کی آنکھیں بند ہونے کے بعد سے ہی اسلامی امت میں جو انحراف پیدا ہوا اس نے رفتہ رفتہ امت کو شریعت کے قوانین کی روح سے دور کر دیا ظاہری شکلیں باقی رہ گئیں تھیں کہ انھیں بھی یزید نابود کرنے پر تلا ہوا تھا ظاہر ہے شریعت کا تحفظ جانشین پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر واجب تھا۔

ب) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی درحقیقت شریعت محمدیؐ کے حلال وحرام ہیں اور اگر ایک وقت آئے کہ شریعت کے حلال کو حرام میں اور حرام کو حلال میں تبدیل کیا جانے لگے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین پر واجب ہوجائے گا کہ دین وشریعت کو محفوظ رکھنے کے لئے اقدام کرے۔

ج) پروردگار عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿**لَقَد کانَ لکم فی رسولِ اللّٰہِ اسوۃٌ حسنۃٌ**۔ یقیناً تمھارے لئے رسول اللہ کی سیرت میں بہترین نمونہ عمل موجود ہے﴾ **(احزاب۔۲۱)** نیز ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿**قُل ان کنتُم تحِبّونَ اللہ فاتّبِعونی یُحبِبکم اللہ . . .** اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تمھیں دوست رکھے گا﴾ (آل عمران۔۳۱) مذکورہ دونوں آیتیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو ہی دین سے تعبیر کرتی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جس ذات پر قرآن نازل ہوا وہ بہر حال قرآن کا عملی نمونہ ہے قرآن دین پروردگار کی لفظی صورت ہے، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت قرآن کی اور دین خدا کی عملی تصویر ہے، لہٰذا سیرت پیغمبر ہی عملی طور سے دین اسلام ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے وصیت نامہ کے اس جملہ سے کہ: (**و اسیرَ بسیرتِ جدّی**) یعنی میں نے لوگوں کو سیرت پیغمبر صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم پر چلانے کے لئے قیام کیا ہے، سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۶۰ھ ہجری تک امت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلما پنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت یعنی اصل دین سے دور ہو چکی تھی ہدایت الٰہی کے نورانی منصب پر ظالمانہ سلطنت کا قبضہ ہو گیا تھا، اس حقیقت تک مسلمان نہ پہنچ پاتے اگر سیرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محافظ اپنی اور اپنے اعوان وانصار کی قربان پیش نہ کرتا اور اسیروں کی مظلومانہ کیفیت کو دیکھ کر خود کو خلیفۃ المسلمین کہلانے والا غرور کے نشے میں اس بات کا اظہار نہ کرتا۔

لَعِبت ھاشمُ بالملک فلا

خبرٌ جاء ولا وحیٌ نَزَل

یعنی بنی ہاشم نے حکومت کے لئے کھیل کھیلا تھا ورنہ نہ کوئی خبر آئی تھی اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی مطلب یہ تھا کہ نہ رسالت تھی اور نہ قرآن ہی نازل ہوا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ امت کو سیرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلانے کے لئے یعنی دین وشریعت پر دوبارہ لانے کے لئے امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا تھا اور آپ کی عظیم قربانی دین و شریعت کے تحفظ ہی کے لئے تھی۔

۲۔ امام حسین علیہ السلام کا ایک مشہور ارشاد ہے: (الا ترؤنَ انّ الحقَّ لا یعمَل ُبه و انّ الباطِلَ لا یُتنا ھیٰ عنهُ، لیرغِبَ المؤمنُ فی لقاء الله محقّاً. . .) (تاریخ طبری۔ ج/۵۔ ص/۴۰۳)

''کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل سے پرہیز نہیں کیا جا رہا ہے ایسے میں مؤمن کو چاہئے کہ حق کی راہ میں خدا سے ملاقات کرے یعنی حق کے لئے جان کی بازی لگا دے''۔

امام حسین علیہ السلام نے اس جملہ کے ذریعہ صاف لفظوں میں واضح کیا ہے کہ ایسے پر آشوب حالات میں مؤمن کے لئے خاموش اور ساکت بیٹھے رہنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ اگر دین و شریعت میں تبدیلی کی جا رہی ہے اور اس کے نورانی چہرے کو مسخ کیا جا رہا ہے تو اس پر واجب ہے کہ شریعت کے تحفظ میں اپنی جان سے بھی گزر جائے۔

۳۔ امام عالی مقام کا ایک اور ارشاد ہے: (انّ ھولاءِ قد لزموا طاعة الشیطان وتَرَکوا طاعة الرحمٰن و اظھروا الفَسادَ و عطّلوا الحدودَ . . . و احلواّ حرامَ الله و حرّموا حلالهُ . . .)

(طبری۔ ج ۷۔ ص/۳۰۰، کامل ابن اثیر۔ ج/۳۔ ص/۲۸۰، خوارزمی۔ ج/۱۔ ص/۲۳۴، انساب الاشراف۔ ج/۳۔ ص/۱۷۱)

امام حسینؑ بنی امیہ اور یزیدیوں کی بے دینی اور ان کے کرتوتوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ

لوگ وہ ہیں جنھوں نے شیطان کی اطاعت و پیروی کو اپنے لئے لازم قرار دیا ہے اور رحمٰن کی اطاعت کو ترک کر دیا فساد کو ظاہر کیا، اللہ کی حدود اور اس کے قوانین کو معطل کر دیا۔۔ ۔اللہ کے حلال کو حرام کر دیا اور اس کے حرام کو حلال کر دیا ہے''۔

یہ گہر بار ارشاد امام حسین علیہ السلام کے جہاد اور ان کے لافانی انقلاب کا ثبوت ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ جس وقت دنیا میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں، مسلمان نبی کا کلمہ پڑھنے کے باوجود رحمٰن کی اطاعت کو چھوڑ کر شیطان کی اطاعت و پیروی کرنے لگیں۔ فسق و فجور، فحشا اور فساد کھلم کھلا انجام دینے لگیں، اللہ کے قوانین اور اس کی حدود کو چھوڑ دیں اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیں تو ایسے میں انقلاب لازمی اور ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ چودہ سو سال پہلے کا زمانہ ہو یا کوئی بھی عہد ہو، شریعت محمدیؐ کے تحفظ کے لئے ہر دور میں حسینی انقلاب لازم و واجب ہے، ہاں طریق کار کی تشخیص صاحبان عقل کا کام ہے۔

۴۔ روز عاشور اظہر کا اول وقت ہے اور ابو ثمامہ صائدی امام سے فرماتے ہیں کہ: مولا یہ نماز ظہر کا اول وقت ہے اور ہم یہ آخری نماز آپ کے ساتھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ امامؑ ابو ثمامہ کو نماز کے یاد کرنے پر دعا دیتے ہوئے فرماتے ہیں: (. . . **ذَکَرتَ الصّلوٰۃ جعَلکَ اللہُ منَ المصلینَ الذّاکرینَ نَعَم ھذا اوّلُ وقتھا . . .**) (طبری۔ ج ا۔ ص ۳۴۷، کامل ابن اثیر۔ ج ۳۔ ص ۲۹) (یعنی تم نے نماز کو یاد کیا خداوند عالم تمھیں ذکر کرنے والے نمازیوں میں قرار دے، ہاں یہ نماز کا اول وقت ہے) اور پھر مقتل کربلا میں تاریخ کی وہ بے نظیر نماز شروع ہوتی ہے جو انقلاب حسینیؑ کی روح بن جاتی ہے۔ اپنے اس عمل سے حسینؑ اور انصار حسینؑ نے عملی طور سے اس بات کا اظہار کیا کہ ہمارا یہ عظیم اقدام صرف خدا کی عبادت و بندگی کے لئے ہے۔ انقلاب حسینیؑ میں تحفظ شریعت کا یہ بے مثل نمونہ ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے

۵۔ شب عاشور امام حسین علیہ السلام نے اپنے دشمن سے ایک شب کی مہلت طلب کی اور جناب ابوالفضل العباسؑ کو حملہ پر آمادہ لشکر کی طرف بھیجا اور فرمایا:

(. . . **اِرجِع الیھِم فان استطعتَ ان تؤ خِّرھم اِلیٰ غدوۃٍو تَدفَعھم عنّا العشیَّۃ نُصلّی لربِّنا اللَّیلۃ و ندعوہُ و نستَغفرہُ فھو یعلم اُ نّی اُحِبُّ الصّلوٰاۃَو تلاوۃَ کتابہِ و کثرۃَ الدّعاءِ والاستغفار**) (انساب الاشراف۔ ج ۳/ ص ۱۸۵، طبری، ج ۷/ ص ۳۱۹ و ۳۲۰؛ کامل۔ ج ۳/ ص ۲۸۵، ارشاد، ص ۲۴۰)

(اے میرے بھائی عباسؑ) ان کی طرف واپس جاؤ اور اگر ہو سکے تو جنگ کو کل تک کے لئے ٹال دو اور

آج کی شب ان لوگوں کو ہم سے دور رکھو تا کہ آج کی رات ہم نماز پڑھیں، اللہ سے دعائیں کریں، اس کی بارگاہ میں استغفار کریں، اس لئے کے وہ (اللہ) جانتا ہے کہ میں نماز، قرآن کریم کی تلاوت اور کثرت دعا و استغفار کو کس قدر پسند کرتا ہوں۔

امام عالی مقام کے اس قول سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قیام حسینیؑ میں اور انقلاب کربلا میں نماز، قرآن مجید کی تلاوت، دعا اور استغفار کو کتنی اہمیت حاصل ہے جسے سید الشہداءؑ نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ان اعمال کو بجا لانے کے لئے خدا کی خوشنودی کی غرض سے ان خدا سے بے خبروں، حیوانوں اور ذلیلوں سے ایک شب کی مہلت مانگتے ہیں۔ پھر اس روشنی میں ہم اہل عزا کو کیا کرنا چاہیئے؟

۶۔ وقت آخر جب امام حسین علیہ السلام اہل حرم سے رخصت ہو رہے تھے تو آپ نے اپنی بہن سے فرمایا تھا: بہن مجھے نماز شب میں فراموش نہ کیجئے گا۔ کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ جناب زینب کبری ثانی زہرا اپنے عزیز ترین بھائی کی اس آخری تمنا کو پورا نہ کیا ہوگا۔ نہیں بلکہ زینب کبری نے بندھے ہوئے ہاتھوں اور بے کجاوہ اونٹ کی سواری پر بھی نماز اور بندگی خدا کو فراموش نہیں کیا۔

۷۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے شام غریباں، تاراجی خیام اور اہل حرم کی بے پردگی کے بعد بھی اس شب کو خدا کی بندگی اور عبادت میں بسر کیا اور کربلا کی جلتی ہوئی ریت پر سجدوں کے پھول اس طرح نثار کئے کہ امام کی عبادت کے آگے شب کا دامن چھوٹا نظر آنے لگا۔

۸۔ جن لوگوں نے شام کا سفر کیا ہے اور قید خانہ اور مسجد اموی کا جائزہ لیا ہے انھوں نے وہاں بھی امام زین العابدین علیہ السلام کی نماز پڑھنے کی جگہ اور اس محراب عبادت کی زیارت کی ہوگی جہاں زنجیروں میں جکڑے ہوئے سید سجاد علیہ السلام نے مصائب و آلام، اسیری اہل بیتؑ، قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود خدا کی عبادت کو فراموش نہیں کیا۔

سر دست ان چند نمونوں کو مدّ نظر رکھیئے اور اس کے بعد اس نکتہ کی طرف توجہ کیجئے کہ اس عظیم انقلاب کو جو اصل میں دین کی تحفظ کے لئے برپا کیا گیا تھا اور اس کے لئے اتنی عظیم قربانیاں دی گئی تھیں، اسے باقی رکھنے کے لئے ان مظلوم اسیروں نے عزاداری کی داغ بیل ڈالی۔ عزاداری کی بنیاد قائم کرنے والوں میں دو اہم شخصیتوں کا نام آتا ہے، ایک ثانی زہرا جناب زینب کبری ہیں اور دوسرے سید سجاد امام زین العابدین علیہ السلام ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرع اس اصل کی حفاظت کے لئے ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہم اس وقت تک حسینؑ کے واقعی عزادار نہیں بن سکتے:

۱۔ جب تک واقعاً کربلا کے مرکزی کردار امام حسین علیہ الصلواۃ والسلام کی معرفت نہ رکھتے ہوں۔

۲۔ جب تک انقلاب کربلا کو واقعی طور سے پہچاننے کی کوشش نہ کریں۔

۳۔ جب تک معرکہ کربلا میں دشمن کے ناپاک عزائم سے آگاہی نہ رکھتے ہوں یعنی دشمن کیا چاہتا تھا اور کن چیزوں کو مٹانا چاہتا تھا اور امام حسین علیہ السلام نے اس کی کوششوں کو ناکام بنانے اور ان الٰہی امانتوں کی حفاظت کرنے میں کتنی عظیم قربانیاں پیش کیں۔

۴۔ جب تک اس روح کربلا کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش نہیں کرتے جسے دین خدا اور دین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا جاتا ہے۔

۵۔ جب تک ہمارے اندر نماز ،قرآن کریم کی تلاوت ،دعا اور استغفار سے محبت اور انھیں بجالانے کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔

۶۔ جب تک ہم حسین اور ان کے اصحاب وانصار کی طرح اپنے ظاہر اور باطن کو مادی اور روحانی برائیوں سے دور نہیں رکھتے۔

۷۔ جب تک نیکیاں اور امر بالمعروف ہمارا اوڑھنا اور بچھونا نہیں ہوتا۔

۸۔ جب تک ہم ہر زمانے کے یزید اور یزیدوں کی شناخت پیدا نہیں کر لیتے۔

۹۔ جب تک ہم اپنے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات اور کدورتوں کو مظلوم کربلا کے نام پر محبتوں میں تبدیل نہیں کر لیتے۔

۱۰۔ جب تک ہم فرش عزا پر بیٹھنے والوں کو ایک ہی نگاہ احترام سے نہیں دیکھتے اور بنام حسین علیہ السلام چھوٹے بڑے، امیر غریب اور گورے کالے کا امتیاز ختم کر کے سب کو حسینؑ کا عزادار نہیں سمجھتے۔

۱۱۔ جب تک ہم شریعت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے والے نہیں بن جاتے اس لئے کہ عزائے حسینؑ انقلاب کربلا کی حفاظت کے لئے ہے اور انقلاب کربلا دین وشریعت کی حفاظت کے لئے وجود میں آیا ہے۔

۱۲۔ جب تک ہم امام حسین علیہ السلام کے زیارتنامہ میں موجود اس جملے کی حقیقت سمجھ کر خود بھی اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے: **اشهدُ انّک قد اقمتَ الصّلواة و آتیتَ الزّکاة و امرتَ بالمعروف و نهیتَ عنِ المنکرِ و اطعتَ الله و رسولَهُ حتّیٰ اتاکَ الیقین** (مفاتیح الجنان) یعنی (اے امام حسینؑ)

میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے نماز کو قائم کیا، زکات ادا کی، نیکیوں کی طرف لوگوں کو بلایا اور برائیوں سے روکا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔

ہم گواہی دینے والوں کو خود بھی یہ سوچنا چاہئے کہ تحفظ شریعت کہ سلسلہ میں جس طرح ہم حسینؑ کے بے مثل اقدام کی گواہی دے رہے ہیں ہم عزاداروں کو بھی اپنی عزاداری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے شریعت کے انھیں مذکورہ ارکان کی پیروی کرنی چاہئے، ورنہ بزرگوں کی دیکھا دیکھی، دل کا فرش بچھانے کے بجائے ظاہری فرش بچھانا اور روایتی انداز میں بے روح عزاداری کرنا اور عظمت غم حسین علیہ السلام کو محسوس کیئے بغیر غم منانا، شاید خدا صاحب شریعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیتؑ کو قبول نہ ہو۔

مآخذ ومنابع:

۱۔ قرآن مجید
۲۔ مفاتیح جنان
۳۔ مقتل خوارزمی
۴۔ مقتل عوالم
۵۔ تاریخ طبری
۶۔ انساب الاشراف
۷۔ کامل ابن اثیر
۸۔ ارشاد شیخ مفید

اخلاقی اقدار کا دینی تعلیمات سے رابطہ

(چند معاصر ایرانی دانشوروں کے نظریات کی روشنی میں)

تحریر: ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

خلاصہ

فلسفۂ اخلاق (Philosophy of Ethics)، فلسفۂ دین (Philosophy of religion) اور کلام جدید (Modern Theology) کی مباحث میں سے ایک اہم بحث یہ ہے کہ آیا اخلاقی اقدار کا انبیا کی بعثت سے بھی کوئی رابطہ ہے یا نہیں؟ اس حوالے سے دانشوروں نے جو مختلف نظریات پیش کیے ہیں اُن میں سے ایک اہم نظریہ، یہ ہے کہ انبیا کی بعثت کا مقصد، اخلاقی اصول واقدار کی تکمیل کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر انبیائے الٰہی مبعوث نہ ہوتے تو اخلاقی اصول واقدار کی داغ بیل ہی نہ پڑتی اور نہ ہی آج اہل دنیا کے پاس اخلاق نام کی کوئی چیز موجود ہوتی۔

اس کے برعکس ہابز، ھیوم اور ان کے پیروکاروں کا عقیدہ یہ ہے کہ اخلاقی اقدار (Ethical Values) کا دین اور دینداری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا انبیا انسان کو عبادت کے رمز ورموز سکھانے آئے تھے؛ نہ اخلاقی اقدار۔ اس مقالہ میں مقالہ نگار نے چند معروف معاصر ایرانی دانشوروں اور علماً کے بیانات کی روشنی میں یہ بات

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہابز، ہیوم اوران کے پیروکاروں کا یہ نظریہ نادرست ہے اور اخلاقی اقدار کا سرچشمہ دین ہی ہے۔ اگر انبیائے الٰہی مبعوث نہ ہوتے اور اخلاق کے اُس نہال کی پرورش نہ کرتے جس کا بیج انسان کی مٹی میں بو دیا گیا ہے تو اخلاقی اقدار کا یہ پودا اُگتا ضرور، لیکن کبھی بھی ایک تناور درخت نہ بن پاتا۔ بنائے برایں، یوں تو ہر نبی کی بعثت سے اخلاقی اصولوں کو نشو ونما کا ماحول ملا؛ لیکن اخلاق کا یہ پودا، سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہی سے پروان چڑھا۔ اگر آپ کی بعثت نہ ہوتی تو عالم کائنات میں کوئی کامل اخلاقی نظام ڈھونڈے نہ ملتا۔

کلیدی کلمات

دین، اخلاق، دینی تعلیمات، اخلاقی اقدار، رابطہ، حدود، حقیقت، اعتبار، فریضہ

موضوع کی اہمیت

بلاشک وتردید متکلمین، فلاسفہ اور سوشلوجسٹک کے معاصر حلقوں میں رائج ایک اہم بحث یہی ہے کہ دین اور اخلاق کا آپس میں کیا رابطہ ہے اور آیا اخلاقی اصول واقدار، دینی تعلیمات کا حصہ ہیں اور انبیائے الٰہی کی بعثت کا مقصد ان اخلاقی اصولوں کی تکمیل ہے یا یہ اصول واقدار مستقل ہیں اور دینی تعلیمات سے مأخوذ نہیں ہیں؟ یہ بحث ایک انتہائی اہم بحث ہے۔ اس بحث کی اہمیت کے حوالے سے ایک مشہور مسلمان فلاسفی عالم، استاد محمد تقی جعفری کا کہنا ہے کہ: ''دین واخلاق، اوران کی طرف دعوت وارشاد کا سلسلہ، ہمیشہ انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا ہے اور یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس کے اثبات کے لئے کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے... بنائے برایں، ہر قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس موضوع پر پوری دقت کے ساتھ بحث کرے اور اس سوال کا جواب تلاش کرے کہ: آیا ایک انسانی معاشرے کے لئے دین اور اخلاق، دونوں کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اور کیا ان دو میں سے تنہا کوئی ایک امر انسانی معاشرے کی راہنمائی کے لئے کافی ہوسکتا ہے؟ آیا دین اور اخلاق دو جدا جدا حقیقتیں ہیں یا اصل میں ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں اور وہی انسانی معاشرہ سعادتمند ہوسکتا ہے جس میں دین اور اخلاق دونوں پر یکساں طور سے عمل کیا جاتا ہو؟ یا نہیں، ایک انسانی معاشرے کے لئے نہ دین ضروری ہے اور نہ ہی اخلاق؟''۔[1]

استاد محمد تقی مصباح یزدی بھی اس بحث کی اہمیت کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ: ''دین اور اخلاق کے رابطے کا موضوع، ایک بہت پُرکشش لیکن ساتھ ہی ساتھ، ایک بہت پُرلغزش موضوع بحث ہے۔ اس موضوع کی

تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی دینی اور فلسفی نظریات کے پیش کیے جانے کی تاریخ پرانی ہے۔ انسانی تاریخ میں فلاسفہ اور دیندار، دونوں حضرات نے ہمیشہا پنے سامنے یہ سوال درپیش پایا ہے کہ: دین اور اخلاق کے باہمی رابطے میں آیا دین اصل ہے اور اخلاق اس کی فرع، یا نہیں، اخلاق اصل ہے اور دین اس کی فرع؟ اور یہ کہ آیا خدا پر ایمان نہ لانے کی صورت میں بھی انسان، اخلاقی اقدار کی بات کرسکتا ہے اور ایک اخلاقی زندگی بسر سکتا ہے؟'' ۲

بنائ برایں، دین اور اخلاق کے رابطے کا موضوع، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ دین اور علم کلام جدید کا ایک انتہائی اہم موضوع ہے جس پر مسلم اور غیر مسلم فلاسفہ اور دانشور حضرات نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ، درج ذیلنکات کی روشنی میں بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

۱) آج کی ماڈرن دنیا میں بہت سے دانشوروں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ زمانہ، سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور اس دور میں دین، انسانی معاشروں کی فلاح و بہبود میں کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا دین اور دینداری کے بغیر بھی انسانی معاشرے اپنے کمال کو پہنچ سکتے ہیں۔ دوسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی شاید ہی کوئی ایسا مفکر ڈھونڈا جاسکے جو انسانی معاشروں میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کے کردار (Role) کا منکر ہو۔ اب اگر محکم اور منطقی دلائل سے یہ بات ثابت کردی جائے کہ اخلاق اور اخلاقی اقدار، دین کا ایک جزو لاینفکہیں، تو پھر یہ دعوی قابل قبول نہیں ہو گا کہ آج کے ماڈرن دور میں انسانیت کو دین اور دینی تعلیمات کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے۔

۲) اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ دینی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کے مابین ایک نہ ٹوٹنے والا بندھن پایا جاتا ہے، تو اس صورت میں اس بحث کا ایک فائدہ، مختلف ادیان کے مقایسہکے وقت سامنے آئے گا۔ اس نظریہ کی اساس پر ادیان کے باہمی مقایسہ میں وہی دین، برتر دین قرار پائے گا جو بہتر سے بہتر اخلاقی نظام اور اخلاقی اقدار کا علمبردار ہوگا۔ یوں بہتر سے بہتر دین کی شناخت میں بھی دین اور اخلاق کے باہمی رابطے کی شناخت، ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

۳) آج کی دینا میں نت نئے اخلاقی مسائل سامنے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مسئلہ کہ آیا اخلاقی اقدار کے تناظر میں ننگ اور بالخصوص انسانی ننگ کا عمل جائز ہے یا نہیں؟ یا سینکڑوں دیگر ایسے اخلاقی مسائل بھی در پیش آسکتے ہیں جو سابقہ ادوار میں درپیش نہ تھے۔ اب ان مسائل کو حل کرتے وقت بھی اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ پہلے یہ طے کرلیا جائے کہ دین اور اخلاق کا آپس میں کیا رابطہ ہے؛ کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اخلاق، دین کا ایک جزو ہے اور اخلاقی اقدار انبیائے الٰہی کی تعلیمات ہی سے اخذ کی جاتی ہیں تو پھر یقیناً ان جدید اخلاقی

مسائل کے حل کے لئے بھی دینی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔لیکن اگر ثابت ہوا کہ اخلاق کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو پھر ہمیں کسی بھی اخلاقی مسئلہ کے حل کے لئے دینی تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔۳

بنأ برایں، یوں تو ہر اہل تحقیق کے لئے مذکورہ موضوع پر قلم اٹھانا ضروری ہے، لیکن جہاں تک ایک دیندار انسان کا تعلق ہے تو ہمارے خیال میں اس موضوع پر اس کے نقطۂ نظر کا واضح ہونا تو بہت ہی ضروری ہے۔اس دعوی کی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم حدیث کی کتب کا ایک سرسری مطالعہ بھی کریں، تو دیکھتے ہیں کہ بہت سی احادیث میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کی تکمیل کو انبیائے الٰہی کی بعثت کا بنیادی مقصد قرار دیا گیا ہے۔سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **"انّما بعثت لأتمم مکارم الاخلاق"**۔۴ (بلاشبہ میں محاسن اخلاق کی تکمیل کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہوں) یاد رہے یہ حدیث مختلف عبارات میں جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے اور ظاہرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مقامات پر، متعدد الفاظ میں اس اہم موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ مولی صالح مازندرانی نے شرح اصول کافی، ج ۸، ص ۲۹ پر، جلال الدین السیوطی نے "تنویر الحوالک"، ص ۶۵۳ پر، امام مالک نے کتاب الموطا، چاپ بیروت، ۱۴۰۶، ص ۹۰۴ پر، اور امام احمد بن حنبل نے مسند، چاپ بیروت، ص ۳۸۱ پر یہ حدیث ملتے جلتے الفاظ میں سرکار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے۔ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **"علیکم بمکارم الاخلاق، فانّ ربّی بعثنی بها ..."**۔(تم پر اچھے اخلاق کا سیکھنا فرض ہے اس لئے کہ میں اسی پر مبعوث کیا گیا ہوں) ۵ حضرت امام سجاد علیہ السلام بھی اپنی ایک دعا میں بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے ہیں: **"هب لی معالی الاخلاق..."**۔۶ خدایا اچھے اخلاق کی بلندیاں عطا فرما۔

اب ایسی احادیث اور روایات دیکھ کر ہر تحقیق طلب دیندار کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ بھلا اخلاق اور اخلاقی اقدار کیا ہیں کہ اُن کی تکمیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد قرار پائی ہے اور ان اصولوں کی پابندی کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے اور حضرت امام سجاد علیہ السلام جیسی شخصیت بھی خداوند تعالی کی بارگاہ میں اخلاقی تکامل و ترقی کی دعا کر رہی ہے۔بنأ برایں، یہ موضوع ایک دیندار انسان کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے اور موضوع کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہم نے کوشش کی ہے کہ اس مقالہ میں اخلاقی اقدار اور دینی تعلیمات کے اس رابطے کو چند نامور معاصر ایرانی علمأ اور دانشوروں کے نظریات کی

روشنی میں بیان کریں۔

کون سا فرضیہ؟

جیسا کہ اس مقالے کے خلاصہ میں اشارہ ہوا ہے، دین و اخلاق کے باہمی رابطے کے حوالے سے کئی فرضیے قائم کیے گئے ہیں۔ ان فرضیات میں سے ایک اہم فرضیہ، یہ ہے کہ دین اور اخلاق ایک دوسرے سے کلی طور پر مستقل ہیں اور ان کا آپس میں کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ دوسرا فرضیہ یہ ہے کہ دین، اخلاق کا جزو ہے۔ تیسرا فرضیہ، یہ ہے کہ اخلاق اور دین میں ہماہنگی تو پائی جاتی ہے لیکن نہ دین، اخلاق کا جزو ہے اور نہ اخلاق، دین کا جزو۔ اور چوتھا فرضیہ یہ ہے کہ اخلاق درحقیقت دین کا جزو ہے اور دینی تعلیمات کے حصول سے ہی اخلاقی اقدار کی پابندی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اب ان فرضیوں میں سے ہم جس فرضیے کو بھی ایک نظریے کے طور پر اپنانا چاہیں، بغیر دلیل کے نہیں اپنا سکتے۔ پس سوال یہ ہے کہ ان فرضیات میں سے کون سا فرضیہ لیا جائے اور اسے کیسے ثابت کیا جائے؟

ہم یہاں آخری فرضیے کو لیتے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم یہ فرضیہ ثابت کر سکے تو نتیجہ کے طور پر دیگر فرضیات خود بخود باطل ہو جائیں گے۔ ہاں! اس فرضیہ کے دیگر فرضیات پر تقدم کی دلیل یہ ہے کہ یہ فرضیہ، تنہا فرضیہ ہی نہیں ہے، بلکہ کئی محققین اور دینداروں کا اپنایا ہوا ایک اہم نظریہ بھی ہے۔ اگر ہم توحیدی ادیان کے متون کا ایک سرسری جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان متون کا دعوی یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے کہ جس کا بیان دین میں نہ آیا ہو۔ عیسائیت، یہودیت اور اسلام کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ ادیان بشریت کے لئے اخلاقی اقدار کا ایک پورا نظام لے کر آئے ہیں۔

ایک مشہور برطانوی عیسائی پادری، ولیم پالی (William Paley) کا کہنا ہے کہ: ''ٹھیک کام، وہ کام ہوتا ہے جو خدا کے ارادے کے مطابق ہو''۔[۷] ایک مشہور عیسائی فلسفی، جان لاک (John Lock) بھی دین اور اخلاق کے باہمی رابطے کے حوالے سے لکھتا ہے کہ: ''اگر ایک عیسائی سے پوچھا جائے کہ ایک انسان کو اپنا وعدہ کیوں وفا کرنا چاہیے؟ تو وہ اس سوال کا جواب یہی دے گا کہ خدا جس کے ہاتھ میں ابدی زندگی اور موت ہے، یہی حکم دیتا ہے کہ وعدہ وفا کرو''۔[۸] جہاں تک دیگر توحیدی ادیان کا تعلق ہے تو مطالعۂ ادیان کے ماہرین کا کہنا یہی ہے کہ سب توحیدی ادیان، اخلاق کو دین کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ مسلمان علماء اور دانشوروں کا خیال بھی یہی ہے کہ اخلاق، دین کا جزو اور اخلاقی اقدار دینی تعلیمات ہی سے مأخوذ ہیں۔

اب اگر ہم مذکورہ فرضیے کو منطقی دلائل کی مدد سے ثابت کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ پہلے مرحلہ میں

ہمارے پاس ''دین'' اور ''اخلاق'' کا واضح تصور ہو۔ ہم دین اور اخلاق کے منبع اور مأخذ کے بارے میں بحث کریں اور یہ دیکھیں کہ دین و اخلاق کی سرحدیں انسانی زندگی کے کن زاویوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نیز یہ کہ مذکورہ فرضیے کے اثبات میں کیا مشکلات و مسائل درپیش ہیں اور ان کا حل کیا ہے؟ بنأ برایں، ہم ذیل میں مرحلہ وار ان موضوعات پر بحث کرتے ہیں تا کہ ایک قطعی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

دین کی تعریف، جوہر اور سرچشمہ

دین کی تعریف بیان کرنے سے پہلے دو اہم نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہم ذیل میں اخلاق کا موازنہ ہر دین سے نہیں بلکہ محض الٰہی توحیدی ادیان سے کرنا چاہتے ہیں۔ بنأ برایں، ضروری ہے کہ ہم تعریف بھی الٰہی توحیدی دین کی پیش کریں۔ اور جیسا کہ بعد میں ثابت کیا جائے گا، توحیدی ادیان میں کسی بھی قسم کا جوہری تعدد اور تنوّع (Diversity) محال ہے۔ لہذا ''دین'' کی ایسی تعریفیں بھی پیش نہیں کی جاسکتیں جن میں جوہری فرق ہو۔

یہاں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''دین'' کی حقیقی تعریف (جسے منطق کی اصطلاح میں حدّ تام یا حدّ ناقص کہا جاتا ہے) پیش کرنا، ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم منطق کی رو سے کسی چیز کی حقیقی تعریف اس وقت پیش کی جاسکتی ہے جب اس کی ذاتیات (جنس اور فصل) معلوم ہوں۔ اور دین چونکہ ایسے عناصر پر مشتمل ہے جن میں حقیقی وحدت نہیں پائی جاتی اور نہ ان کا حقیقی وجود پایا جاتا ہے، پس دین کی حقیقی تعریف بھی نہیں کی جاسکتی۔ بنأ برایں، بقول آیۃ اللہ جوادی آملی، دین کی تنہا مفہومی تعریف ہی ممکن ہے اور یہ تعریف ان کے بقول یہ ہے: ''دین، عقائد، اخلاق اور قوانین و احکامات کے اس نظام کا نام ہے جو فرد اور معاشرہ کا نظم و نسق چلانے اور انسانوں کی وحی اور عقل کی روشنی میں پرورش کے لئے آیا ہے''۔ اُن کی پیش کردہ ایک اور تعریف کے مطابق بھی دین عام معنوں میں: ''ماورائے طبیعت اور خدا کا انسان کے ساتھ، انسان کے رشد و کمال کے لئے ارتباط برقرار کرنا ہے''؛ اور خاص معنوں میں: ''دین، خداوند تعالی کی طرف ''ہے''۔[۹] اور ''ہونا چاہیے''۔[۱۰] سے منسوب اس مجموعے کا نام ہے جو انسان کی ہدایت و راہنمائی اور اسے کمال تک پہنچانے کے لئے وحی اور معصومین علیہم السلام کی سنت سے تشکیل پائے''۔[۱۱] بعض دیگر علمأ نے بھی دین کی ایسی ہی تعریف پیش کی ہے۔ ان کی نظر میں: ''دین، عقائد اور اوامر و نواہی کے مجموعے کا نام ہے''۔[۱۲] ایک اور تعریف کے مطابق: ''دین، خدا کی طرف منسوب حقائق اور احکام کے مجموعے کا نام ہے''۔[۱۳]

اگر ہم دین کی ان تعریفوں پر خوب دقت کریں تو دین کے جوہر اور اس کی ماہیت کو درک کر سکتے ہیں اور پھر اس کا اخلاق یا کسی دیگر چیز کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں دین، درج ذیل بنیادی عناصر کے مجموعے کا نام ہے:

۱۔ ایک ایسی ماورائے طبیعت (Supernatural) طاقت پر ایمان جو حیات، قدرت، علم اور ارادے کے صفات سے متصف ہے اور عالم کائنات کی تدبیر اس کے ہاتھوں میں ہے۔

۲۔ یہ طاقت اطاعت اور بندگی کے لائق ہے۔

۳۔ اس طاقت نے ہم انسانوں کے ساتھ رابطہ برقرار کیا ہے اور اپنے انبیاؑ کے ذریعے ہمارے لیے ایسے قوانین بنا کر بھیجے ہیں کہ ہمیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیے۔

۴۔ ایک ایسا دن آئے گا کہ جس دن سب انسان، اس مقدس طاقت کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائیں گے۔

دین حق، فقط ایک

دین کے ان بنیادی عناصر میں غور وفکر سے نہ فقط دین کی ماہیت اور اس کے سرچشمہ کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ الٰہی دین اپنے جوہر اور اپنی ماہیت کے لحاظ سے ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ ویلیم جیمز جیسے کئی غیر مسلمان دیندار دانشوروں کا عقیدہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ پوری انسانیت کا دین فقط ایک ہو۔ بقول جیمز: ''میں یہ باور نہیں کرسکتا کہ تمام افراد بشر کے لئے، جن میں ماحول، طاقت اور توانائی کے لحاظ سے آپس میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے، ایک جیسے اعمال اور فرائض انجام دینا، لازم ٹھہرے''۔[۱۴]

ہم سمجھتے ہیں کہ جیمز اور ان کے ہم پیالہ دانشوروں کا یہ نظریہ، کسی طور سے قابل قبول نہیں ہے؛ کیونکہ بقول آقا جوادی آملی: ''دین انسان کی تربیت کے لئے آیا ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان اپنی ماہیت کے لحاظ سے نوع واحد ہے۔ اور جب ایسا ہے تو وہ دین بھی جو انسان کی تربیت کے لئے آیا ہے، واحد ہونا چاہیے... سب انسان ہر حال میں حقیقت واحدہ ہیں اور اپنی فطرت، عقل اور دل کے لحاظ سے بھی ایک سنخ ہیں؛ اگرچہ بدنی ساخت، عالم طبیعت کے ساتھ رابطے اور رہن سہن کے طور طریقوں کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں... لیکن انسانی زندگی کے وہ امور جن کا اس کی فطرت سے تعلق ہے، دائمی اور ثابت ہیں''۔[۱۵]

بنائ براین، ادیان کی کثرت کے قائلین کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادیان کی کثرت فقط اسی

صورت میں قابل تصور ہے جب ان ادیان کا انسانی فطرت اور کائنات کی نہائی حقیقت (خدائے ذوالجلال) کے بارے میں مدعیٰ ایک نہ ہو اور جب مدعیٰ متعدد ہوں تو انسانی عقل و منطق کی رو سے متعدد مدعیٰ بیک وقت صادق نہیں ہو سکتے۔ جب بھی عقل و منطق کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، فقط ایک ہی مدعیٰ ٹھیک ثابت ہوگا اور باقی سب باطل قرار پائیں گے۔ ہاں! زمان و مکان کے تقاضوں کے لحاظ سے اگرچہ شریعتوں کی کثرت کا تصور بجا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ توحیدی ادیان اپنے جوہر کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں۔ پس ادیان و شرایع کی کثرت، منطقی اصطلاح میں ''تشکیکی کثرت'' ہے؛ یعنی ایسی کثرت جس کی برگشت معارف بشری اور زمان و مکان کے تقاضوں کی طرف ہے، نہ کہ دین الٰہی کے جوہر اور ماہیت کی طرف۔

اخلاق کی تعریف

شیخ ابوعلی مسکویہ نے اخلاق کی تعریف میں لکھا ہے کہ: ''اخلاق، انسان کی ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں وہ کسی کام کو بغیر سوچ و بچار کے انجام دیتا ہے''۔[۱۶] مرحوم فیض کاشانی نے بھی اخلاق کی تعریف میں کہا ہے کہ: ''اخلاق، نفس میں راسخ اس حالت کا نام ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے انسان کاموں کو بڑی آسانی سے اور بغیر سوچ و بچار کے انجام دیتا ہے...''۔[۱۷]

ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ تعریفوں میں ''اخلاق'' سے مراد خاص انسانی خصائل لیے گئے ہیں، نہ کہ تعلیمات کا وہ خاص نظام جو ''دین'' اور ''قانون'' (Law) کے ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے۔ فرانکنا (William K. Frankena) نے ''اخلاق'' کی تعبیر کے اِن دو مختلف معنوں کی طرف بخوبی اشارہ کیا ہے۔ اس کے بقول: ''اخلاق کی اصطلاح، بعض اوقات ''ضد اخلاق'' پر بولی جاتی ہے؛ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اخلاق کا نچوڑ ''محبت'' ہے... لیکن بعض اوقات ''اخلاق'' کا کلمہ استعمال کر کے اس سے ایک ایسا نظام مراد لیا جاتا ہے جو ہنر، سائنس، قانون، قرارداد، یا دین کے مقابلے میں قرار پاتا ہے۔ پس اگر یہ پوچھا جائے کہ اخلاق کیا ہے، قانون اور اخلاق کا فرق کیا ہے اور اخلاق کا دین سے کیا رابطہ ہے؟ تو اِس اصطلاح کا یہی دوسرا معنی ہی مراد ہوتا ہے''۔[۱۸] اسی دوسرے معنے میں نورمن گیسلر (Norman L.Gasler) نے ''اخلاق'' کی تعریف یوں پیش کی ہے: ''اخلاق، انسان کی دنیاوی ذمہ داری کا نام ہے؛ دین انسان کی جہان ماورائے طبیعت سے اترنے والی وحی کے ذریعے معین کی جانے والی ذمہ داری کا نام ہے۔ اخلاق کا لازمہ فریضہ (Obligation) ہے، جبکہ دین کا لازمہ عبادت (Prayer) ہے''۔[۱۹]

بنائ برایں، دین اور اخلاق کے موازنہ میں ''اخلاق'' کی اصطلاح سے ہماری مراد اصول وقواعد کا ایک خاص سسٹم ہے۔اور اس سسٹم کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ: ''اخلاق''، اُن راہنما قواعد کا نام ہے جو انسان کی اُن ضروریات، خواہشات، اور اغراض سے پیدا ہونے والے خواہشات کے اُس درونی تعارض کے حل کا کام دیتا ہے جو دوسرے انسانوں کی زندگیوں کو بھی متاثر کرتا ہے؛ اور بہ طور کلی اخلاق، قواعد کے اس مجموعے کا نام ہے جو مختلف افراد کے مابین پیدا ہونے والے اختلافات کو دور کرنے کے کام آتا ہے۔''۔۲۰

اخلاق کا سرچشمہ

یہاں ایک اہم بحث یہ ہے کہ مذکورہ تعریف کی روشنی میں ''اخلاق'' کا سرچشمہ کیا ہے؟ ہمارا دعوی یہ ہے کہ ''اخلاق'' کا سرچشمہ ''دین'' ہے اور اخلاقی اقدار کا مأخذ، دینی تعلیمات ہیں۔گویا اس قسم کے اخلاقی اصول و اقدار کہ: ''ہمیشہ سچ بولو''، ''خیانت برائی ہے''، ''عدل اچھا اور ظلم برا ہے'' وغیرہ وغیرہ ہمیشہ دینی تعلیمات سے اخذ کی جاتی ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ خداوند تعالی نے سچ بولنے اور عدل ومساوات جیسے کاموں کی انجام دہی کا حکم دیا ہے اور برعکس، خیانت اور ظلم جیسے کاموں سے روکا ہے، پس سچائی، عدالت اور اس قبیل کے دیگر کام، اچھے اور اخلاقی کام ٹھہرے ہیں، جبکہ خیانت، ظلم اور اس قسم کے دیگر کام، برائی قرار پائے ہیں۔دیگر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اخلاقی اصول وضوابط اس لیے لازم الاجرأ ہیں کہ خداوند تعالی نے ان کا حکم دیا ہے۔پس اصل دعوی یہ ہے کہ اخلاق سرچشمہ، دین اور اخلاقی اقدار کا مأخذ دینی تعلیمات ہیں۔البتہ اس دعوی کی دو تفسیریں پیش کی گئی ہیں؛ اس تفصیل کے ساتھ کہ اگر ہم اخلاقی اصول واقدار کو ''x'' کا نام دے دیں تو اس دعوی کا مطلب کہ اخلاق کا سرچشمہ، دین ہے، یہ ہے کہ: (۱) چونکہ خدا ''x'' کا خالق ہے، پس ''x'' اچھائی ہے۔(۲) چونکہ خدا نے ''x'' کا حکم دیا ہے لہٰذا ''x'' اچھا ہے۔

اب اس دعوی کو اس کی مذکورہ دونوں تفسیروں کے ساتھ ثابت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ دین کی حدود اتنی وسیع ہیں کہ تمام اخلاقی اصول واقدار بھی اس کے اندر آ جاتے ہیں۔یہ ثابت کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ: (۱) دین، زندگی کے کن شعبوں میں انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے؟ (۲) اور جن شعبوں میں دین ہماری راہنمائی کرتا ہے، آیا کوئی اور نظام (مثال کے طور پر قانون یا اخلاق) بھی ان شعبوں میں دین سے بہتر یا دین کے برابر کی راہنمائی کر سکتا ہے؟ اگر ہم یہ ثابت کر سکیں کہ دین، جن شعبوں میں انسان کی راہنمائی کرتا ہے ان میں اخلاقیات کا شعبہ بھی شامل ہے اور جس قدر دین اس شعبے میں ہماری راہنمائی کر سکتا ہے، اخلاقی اقدار کا

کوئی بھی غیر دینی نظام ویسی راہنمائی نہیں کرسکتا، تو اس صورت میں یہ بات ہمیشہ کے لئے ثابت ہو جائے گی کہ ایک حقیقی اخلاقی نظام فقط دین اور دینی تعلیمات ہی سے مأخوذ ہوتا ہے۔ پس ہمیں یہاں یہ ثابت کرنا کہ کہ دین نہ تنہا اخلاقیات کے باب میں انسان کی راہنمائی کرتا ہے بلکہ اس باب میں دین کے متوازی کوئی غیر دینی نظام انسان کی راہنمائی نہیں کرسکتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس دعوے کو ہمیشہ کے لئے ثابت کیا جا سکتا ہے؟ بعض محققین کا کہنا یہ ہے کہ ایسا کوئی دعوی ہمیشہ کے لئے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا ہر دور کے دینداروں کا یہ فریضہ ہے کہ ہر زمانے میں اس موضوع پر بحث کریں اور اپنے عصری تقاضوں کے مطابق اس موضوع پر بحث کریں۔ اس امر کی دلیل یہ ہے کہ ایک طرف دین اور دینی تعلیمات کی کئی سطوح ہیں اور ایک غیر معصوم انسان کے لئے ان سب سطوح سے آشنا ہونا محال ہے۔ دین ہر زمانے میں اس زمانے کے لوگوں کے لئے اپنی ایک نئی سطح آشکار کرتا ہے؛ وہ سطح جو اس سے پہلے کے زمانے کے عام انسانوں کے لئے بالکل مجہول رہی ہو اور حقیقت تو یہ ہے کہ دین کی جاودانگی کا راز بھی اسی امر میں پوشیدہ ہے۔

دوسری طرف خود انسانی حقیقت کے بھی کئی مراتب ہیں۔ ہر دور کے ایک عام انسان کے لئے خود اپنی حقیقت کی تمام تر سطوح سے آشنائی ناممکن ہے۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ہر دور میں انسانی حقیقت اور زندگی کے کئی نئے پہلو اور نئی سطوح سامنے آتی ہیں جن کی وجہ سے ہر دور کے انسانوں کو نئے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہر دور کا انسان ان نئے مسائل کے تناظر میں دین کا ایک نئے زاویے سے مطالعہ کرے۔ یہیں سے ہر دور میں عالم اسلام میں ایک دینی مرجع اور مجتہد کے وجود کی ضرورت کا راز کھلتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر دور کے مسائل (منجملہ اخلاقی مسائل) کو حل کرنے کے لئے خود اُسی عصر کے انسانوں کے لئے بحث و تمحیص ضروری ہے۔[۲۱]

نتیجہ یہ کہ اس موضوع پر بحث ایک کھلی بحث (Open Debate) ہے اور ہمیں اس بحث میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔ ہاں ہماری بحث کا طریقۂ کار (Method) یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ خود دین اور دینی متون، دین کی حدود اور دائرۂ کار کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور آیا کوئی غیر دینی اخلاقی نظام، دینی اخلاقی نظام کا نعم البدل بھی بن سکتا ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کا اجمالی جواب یہی ہے کہ دین کی حدود اور اس کا دائرۂ کار اتنا

وسیع ہے کہ تمام اعلیٰ اخلاقی اقدار اس کے دامن میں آ جاتے ہیں اور ان اصول وضوابط کی جو توجیہ (Justification) دین پیش کرسکتا ہے، اخلاقیات کا کوئی غیر دینی نظام، پیش نہیں کرسکتا۔ ذیل میں ہم نمونے کی چند ایسی آیات وروایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جو ہمارے اس دعوی کی دلیل ہیں:

دلائل وشواہد

۱) **''و عنده مفاتيح الغيب لايعلمها الّا هو و يعلم ما فى البرّ و البحر و ما تسقط من وّرقة الّا يعلمها و لارطب و لايابس الّا فى كتاب مّبين''۔** ۲۲

یعنی: ''اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا؛ اور جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو (بھی) وہی جانتا ہے؛ اور کوئی پتہ بھی نہیں گرتا مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے؛ اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری، خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ کتاب مبین میں موجود ہے۔''

اس آیت کا آخری جملہ اس دعوی کی بہترین دلیل ہے کہ قرآن کریم ایک کتاب مبین ہے اور مبین کا ایک معنی ''بیان کرنے والا'' ہے۔ بنأ براین، ''مبین'' کتاب کی صفت اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ ۲۳ اب قرآن کریم کے کتاب مبین ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ قرآن، انسانی زندگی کے ہر شعبے میں مکمل راہنمائی کا نام ہے، اور یوں اخلاقیات بھی انسانی زندگی کا ایک اہم شعبہ ہونے کے ناطے قرآنی تعلیمات کے دائرہ میں قرار پاتے ہیں۔

۲) **'' ثمّ اٰتينا موسى الكتٰب تماما على الّذى أحسن تفصيلا لكلّ شىء ....و هٰذا كتاب أنزلناه مبارک فاتبعوه...''۔** ۲۴

یعنی: ''پھر ہم نے جو نیکی کرے اس پر اپنی نعمت تمام کرنے کے واسطے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور اس میں ہر چیز کی تفصیل بیان کردی...اور یہ کتاب (قرآن) جس کو اب ہم نے نازل کیا ہے، برکت والی کتاب ہے تو تم لوگ اس کی پیروی کرو!''

۳) **''... و نزّلنا عليک الكتاب تبيانا لكلّ شىء و هدى و رحمة و بشرىٰ للمسلمين''** ۔۲۵

یعنی: ''اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس میں ہر شئے کا (شافی) بیان ہے...''

علامہ طباطبائی اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی عمومی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ قرآن ہر شئے کے لئے تبیان ہے اور: ''چونکہ قرآن عامۃ الناس کے لئے ہدایت کی کتاب ہے اور اس کا مقصد لوگوں کی ہدایت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، ظاہرا ''کلّ شیء'' سے مراد، ہر وہ شئے ہے جو انسانی ہدایت کے کام آتی

ہے۔مثال کے طور پر مبدأ و معاد سے مربوط حقیقی تعلیمات، اخلاق فاضلہ، شرائع الٰہی، تاریخ اور ایسے مواعظ کہ لوگ جن تک رسائی اور ان سے ہدایت پانے کے محتاج ہیں، قرآن اُن سب کا بیان ہے''۔۲۶

۴) ''... و کلّ شیء فصّلناہ تفصیلا''۔۲۷

یعنی: ''...اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے...''

اگر ہم مذکورہ آیات سے ہٹ کر عالم اسلام کے دینی پیشواؤں کی روایات کی طرف رجوع کریں تو ہمیں کثرت سے ایسی روایات مل جاتی ہیں جن میں اخلاقی احکام و اقدار کا مفصل بیان موجود ہے۔ یہاں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اخلاق، درحقیقت دین ہی کا ایک جزو ہے اور اخلاقی اقدار و احکام کا مفصل بیان دینی متون ہی میں پایا جاتا ہے۔

اشکال

وہ لوگ جو یہ بات تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں کہ دین، انسانی معاشروں کا نظم و نسق چلانے میں کوئی قابل ذکر کردار ادا کر سکتا ہے، انھوں نے اس دعوی پر کہ اخلاقی احکام و اقدار کی توجیہ و تفسیر دینی تعلیمات ہی کر سکتی ہیں، کئی اعتراضات کیے ہیں۔ ہم اس مقالے میں اختصار کے سبب ان میں سے، اُس اہم اور اساسی اشکال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر اس اشکال کا جواب نہ دیا جائے تو ہمارا یہ دعوی ثابت نہیں ہو پاتا۔

اس اشکال کا نقطۂ آغاز درحقیقت افلاطون کا یہ سوال ہے کہ ''آیا وہ کام جو دین سے مطابقت رکھتا ہو، اس لیے خداؤں کا محبوب ہوتا ہے کہ دین سے مطابقت رکھتا ہے؛ یا نہیں، چونکہ وہ کام دین سے مطابقت رکھتا ہے لہذا خداؤں کا محبوب ہوتا ہے؟''۔۲۸ اس سوال کو سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ آیا ''مطابقت'' اصل اور خداؤں کی ''محبوبیت'' فرع ہے یا خداؤں کا محبوب ہونا اصل اور دین کے ساتھ ''مطابقت'' فرع ہے؟ افلاطون کا یہ سوال بعد میں یہ شکل اختیار کر گیا کہ آیا اخلاقی احکام و اقدار کسی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے مثال کے طور پر یہ حکم ایک حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ ''پانی، آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنتا ہے''؟ یا نہیں، اخلاقی احکام شخصی سلیقوں اور پسند و ناپسند کا بیان ہیں اور انسانی احساسات و عواطف سے ہٹ کر کسی خارجی حقیقت کا بیان نہیں ہیں؟

تھامس ہابز (Thomas Hobbes) نے اس سوال کے جواب میں اخلاقیات کی ''اعتباریت'' کا نظریہ پیش کیا۔ اس کی نظر میں ''خوبی'' اور ''بدی'' کا معیار تنہا ہماری پسند و ناپسند ہی ہے؛ ورنہ درحقیقت بہت سی اشیأ و

افعال خود بخود نہ اچھے ہوتے ہیں نہ برے۔اس کے بقول: ''ایک شخص کی خواہش یا آرزو کا موضوع جو بھی ہو، وہ اسے ''خیر'' (اچھائی) قرار دیتا ہے؛ اور وہ اپنے کینے اور دشمنی کے موضوع کو ''شر'' (برائی) قرار دیتا ہے...''۔۲۹ کاپلسٹن، ہابز کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد اس کی توضیح میں لکھتا ہے کہ: ''بنائ برایں، نیکی اور بدی، نسبی مفاہیم ہیں۔ نہ کسی مطلق نیکی کا وجود پایا جاتا ہے اور نہ ہی کسی مطلق برائی کا؛ اور ہمارے پاس کوئی ایسا عمومی اور خارجی حقائق سے لیا گیا معیار موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر نیکی اور بدی کو پرکھا جا سکے''۔۳۰

خلاصہ یہ کہ ''نیکی'' اور ''بدی'' کے مفاہیم فقط ہماری پسند و ناپسند سے وابستہ ہیں اور ان کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ بنائ برایں، جب ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ فلاں چیز ''اچھی'' ہے یا ''بری''، یا فلاں کام ''نیک'' ہے یا ''بد''، تو ایسا نہیں ہے کہ وہ چیز یا وہ کام واقعی طور پر اچھے یا برے ہوں، بلکہ ہم تو فقط اپنا سلیقہ اور چاہت بتا رہے ہوتے ہیں۔ پس اخلاقیات کا پورا باب ایسا ہی ہے اور سچ، عدالت اور شجاعت جیسے موضوعات کے اچھائی یا نیکی ہونے کا مطلب فقط یہی ہے کہ لوگ سچ، عدالت اور شجاعت کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی زمانے میں لوگ جھوٹ، ظلم اور بزدلی کو پسند کرنے لگیں تو یہی موضوعات اخلاقی لحاظ سے اچھائی قرار پائیں گے۔

اگر ہابز، ہیوم اور ان کے پیروکاروں کا اخلاقی اصول و اقدار کے بارے میں یہ نظریہ مان لیا جائے تو پھر یہ دعوی نہیں کیا جا سکتا کہ اخلاقی اصول و اقدار کا سرچشمہ، دین اور دینی تعلیمات ہیں۔ کیونکہ جہاں تک دین اور دینی تعلیمات کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں قطعی رائے یہی ہے کہ وہ حقائق کے بیان کرنے والے ہیں؛ یعنی جب دین یہ کہتا ہے کہ خدا ہے، قیامت ہے وغیرہ وغیرہ، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ احکام کسی کی پسند و ناپسند کا بیان نہیں ہیں بلکہ واقعی طور پر خدا اور قیامت کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور جب ایسا ہے تو علم منطق کے قواعد کی رو سے اخلاقی اصول و اقدار کو دینی تعلیمات سے اخذ نہیں کیا جا سکتا؛ کیونکہ اخلاقی اصول و اقدار اعتباری ہیں اور دینی تعلیمات حقیقی؛ اور علم منطق کے قواعد کی رو سے اعتباری احکام و قواعد کو حقیقی احکام و قواعد سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

اس مطلب کی توضیح یہ کہ ایک صحیح منطقی استدلال کی پہلی شرط یہ ہے کہ استدلال کا نتیجہ، اس کے مقدمات سے تضاد نہ رکھتا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ نتیجے میں کوئی ایسا مفہوم نہ آیا ہو جو مقدمات میں نہ پایا جاتا ہو۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ نتیجہ قوت و ضعف کے لحاظ سے مقدمات کے ہم پلہ ہو یا مقدمات سے ضعیف تر ہو۔ اب اگر ہم یہ دعوی کریں کہ اخلاقی اصول و اقدار (جو کہ اعتباری ہیں اور جن کا محور لوگوں کی پسند و ناپسند ہے) ایک منطقی استدلال میں دینی تعلیمات سے (جو حقیقی ہیں اور جن کا محور حقائق ہیں) اخذ کیے جاتے ہیں، تو گویا ہم ایک طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک منطقی استدلال کا نتیجہ ایسا ہو سکتا ہے جو مقدمات میں ذکر نہ ہوا ہو اور دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے

استدلال کا نتیجہ مہمل ہے اور کسی حقیقت کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔

جواب

جن لوگوں کا دعوی یہ ہے کہ اخلاقی اصول واقدار، دینی تعلیمات سے اخذ ہوتے ہیں، انہوں نے اس اہم اشکال کے دو طرح سے جواب دیے ہیں۔ بعض لوگ یہ تو مانتے ہیں کہ اخلاقی اصول واقدار، اعتباری مفاہیم پر مشتمل ہوتے ہیں اور حقائق بیان نہیں کرتے، لیکن ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم ان اعتباری مفاہیم کی توجیہ (Justification) حقائق ہی کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کے ''نیلسن''، کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جو مدعی ہیں کہ ہم اخلاقی احکام کی توجیہ حقیقی احکام وعلوم ہی کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔۔۳۱ جبکہ بعض دیگر دانشوروں کا خیال ہے کہ اصولی طور پر اخلاقی احکام واقدار، اعتباری ہیں ہی نہیں؛ بلکہ حقائق بیان کرنے والے ہیں۔ مثال کے طور پر'' جان لاک'' کا عقیدہ یہ ہے کہ اخلاقی قضایا، حقائق کی شناخت کرواتے ہیں۔۳۲۔'' ویلیم فرانکنا'' بھی اخلاقی فرائض واحکامات کو واقعی (عینی) شمار کرتا ہے۔۳۳۔'' والٹر اسٹیس'' کی نظر میں بھی اخلاقی اقدار، اعتباری نہیں بلکہ عینی ہیں۔۳۴۔

بنأ برایں، اخلاقی احکام کا دینی تعلیمات سے اخذ کرنا، علم منطق کے استدلال و برہان کے قواعد وضوابط کے عین مطابق ہے۔ ہم اختصار کے پیش نظر یہاں ان دانشوروں کے نظریات کی تفصیل بیان نہیں کر سکتے لیکن ذیل میں چند معاصر ایرانی علمأ اور دانشوروں کے نظریات کی روشنی میں'' ہابز''، ''ہیوم'' اور ان کے پیروکاروں کے اس اہم اشکال کا جواب دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اخلاقی اصول واقدار کا دینی تعلیمات سے نہ فقط گہرا تعلق ہے بلکہ یہ اصول دینی تعلیمات ہی سے اخذ ہوتے ہیں؛ اور اگر کسی معاشرے میں دین کا وجود نہ پایا جاتا ہو تو اس معاشرے میں اخلاق اور اخلاقی اقدار بھی مفقود ہوتی ہیں۔

تصور کائنات اور آئیڈیالوجی

شہید مطہری وہ معاصر ایرانی محقق ہیں جن کی نظر میں انسان کے تصّور کائنات اور اس کی آئیڈیالوجی میں گہرا رابطہ پایا جاتا ہے۔ ان کی نظر میں انسان اس وقت تک کوئی بھی آئیڈیالوجی نہیں اپنا سکتا جب تک کہ اپنا تصوّر کائنات واضح نہ کرے۔ یہاں آئیڈیالوجی سے اُن کی مراد زندگی گذارنے کا کوئی بھی لائحۂ عمل ہے۔ یعنی انسان جب تک کائنات کے بارے میں ایک خاص شناخت، نظریہ یا تصّور نہ رکھتا ہو، اس وقت تک کائنات میں زندگی گذارنے کا کوئی واضح پروگرام اور منصوبہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔ بنأ برایں، اخلاقی اصول واقدار بھی ایک آئیڈیالوجی

کی حیثیت سے اور زندگی گزارنے کا ایک خاص لائحۂ عمل ہونے کے ناطے، انسان کے تصوّر کائنات ہی سے اخذ ہوتے ہیں۔ شہید مطہری ''جاودانگی اخلاق'' کے موضوع پر اپنے لیکچرز میں یہ سوال اٹھانے کے بعد کہ: ''آیا کوئی ایسا قیاس بھی پایا جاتا ہے جس کے مقدمات اخباری ہوں اور نتیجہ انشائی ہو''؟ لکھتے ہیں: ''ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ ایسا قیاس نہیں پایا جاتا، ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر ایسا قیاس ٹھیک ہو تو اس کی توجیہ کیا ہے''؟۔۳۵

مرتضی مطہری لکھتے ہیں کہ: ''ایک آئیڈیالوجی، تصوّر کائنات اور انسان شناسی کے بغیر ناممکن ہے۔ ہر آئیڈیالوجی کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے وہ کائنات اور انسان کے بارے میں اپنا تصوّر بتائے تاکہ اس کے مطابق اپنے معاشرتی مکتب میں (زندگی گذارنے کے) مقدس نمونے (Ideals) دے سکے''۔۳۶ مطہری مدعی ہیں کہ: ''زندگی گذارنے کا ہر اصول اور ضابطہ، خواہ نانخواہ، کائنات کے بارے میں ایک خاص تصوّر، عقیدے اور اس کی ایک خاص تحلیل وتفسیر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ ہر دین وآئین اور معاشرتی زندگی کا ہر مکتب، ایک خاص تصوّر کائنات ہی پر موقوف ہوتا ہے...(بنأ برایں) یہ ''احکام'' منطقی نتیجہ ہیں ان ''حقائق'' کا؛ بالخصوص وہ حقائق جن کا کام فلسفہ اولیٰ اور مابعد الطبیعیت کے علم وحکمت کا بیان ہے''۔۳۷

استاد مطہری زندگی گزارنے کے اُن اخلاقی اصولوں اور نمونوں کو جو کسی تصوّر کائنات پر موقوف نہ ہوں، ''توہّم پرستی'' قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس، اُن کے بقول: ''اگر اصول اور آئیڈیل پرستی، دین اور مذہب پر موقوف ہوں تو گویا ایک ایسے تصور کائنات سے وابستہ ہیں جس کا منطقی نتیجہ اُن معاشرتی اصولوں اور آئیڈیلز کے مطابق زندگی گزارنا ہے''۔۳۸ مطہری ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں کہ: ''تصوّر کائنات، وہ اساس ہے جس پر اصول پرستی اور آئیڈیالوجی کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے...اگر ہم علمائے سلف کی اصطلاحات میں بات کرنا چاہیں تو یوں کہنا چاہیے کہ آئیدیالوجی، ''حکمت عملی'' ہے اور تصوّر کائنات، ''حکمت نظری'' ہے اور حکمت عملی، حکمت نظری کے بطن سے جنم لیتی ہے...''۔۳۹

ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آقائے مطہری حکمت عملی (اخلاق) اور حکمت نظری (دین) کے درمیان منطقی ارتباط کے قائل ہیں اور اخلاق کو دین کا فرزند سمجھتے ہیں۔ ہاں! یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مطہری، علامہ طباطبائی کے شاگرد اور ان کے نظریات کے شارح ہیں اور علامہ کا اخلاقی فرائض، یعنی ''چاہیے'' اور ''نہ چاہیے'' (باید ونباید) اور خوبی وبدی (حسن وقبح) کے مفاہیم کے بارے میں نظریہ، یہ ہے کہ یہ مفاہیم، اعتباری ہیں۔ اُن کے بقول: ''خوبی اور بدی کے مفاہیم، دونسبی اور اضافی صفات ہیں، اگرچہ عدل اور ظلم جیسی مثالوں میں یہ دائمی اور ثابت ہیں اور مال کے انفاق جیسی مثالوں میں (عارضی اور قابل تغییر کہ) انفاق اگر مستحق

پر ہو تو نیکی اور اگر غیر مستحق پر ہو تو بدی شمار ہوتا ہے۔''۔۴۰؎ اور جب یہ مفاہیم اعتباری اور نسبی ہیں تو: ''اعتباریات سے برہان کی توقع نہیں رکھی جا سکتی''۔۔۴۱؎ بنا بر ایں، چونکہ شہید مطہری نے اپنے حاشیوں میں بغیر کسی نقد و تبصرہ کے علامہ کی انہی باتوں کی تشریح و توضیح پیش کی ہے پس ان کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اخلاقیات جو کہ اعتباری مفاہیم (حسن و قبح اور ''چاہیے'' و ''نہ چاہیے'' کے مفاہیم) پر مشتمل ہیں، دین سے جو کہ حقیقی مفاہیم پر مشتمل ہے قابل اخذ نہیں ہیں۔

مقالے کے اختصار کے مدنظر ہم اس سوال کا تفصیلی جواب یہاں بیان نہیں کر سکتے اور اس بحث کو ایک الگ مقالہ پر چھوڑتے ہوئے اتنا کہنا چاہیں گے کہ شہید مطہری نہ فقط مدعی ہیں کہ اخلاق، ایک آئیڈیالوجی کی حیثیت سے دین سے (جو ایک تصوّر کائنات پیش کرتا ہے) اخذ کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کی نظر میں جب تک اخلاقی اصول و اقدار، دینی تعلیمات سے وابستہ نہ ہوں، اُن کے اجرا اور ان پر عمل کی قطعاً کوئی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ''فلسفۂ اخلاق'' میں اخلاق کا نظریۂ عواطف، وجدان، نوع دوستی اور دیگر نظریات ردّ کرتے ہوئے فقط نظریۂ پرستش ہی قبول کیا ہے۔ ان کی نظر میں خداشناسی اور دینداری ہی انسانیت کا سنگ بنیاد ہے اور خداشناسی اور دینداری کے بغیر اخلاق، بے معنی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''خود میں نے بھی بہت سنا ہے اور ایک عرصہ تک اس بات کا معتقد رہا ہوں (کہ اخلاق، دینداری کا محتاج نہیں ہے)۔ لیکن اب آپ کے سامنے ایک مثال سے عرض کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کا اخلاق فقط شخصی ہوتا ہے (یعنی وہ فقط پرسنل لائف میں اخلاقی اصول و اقدار کا خیال رکھتے ہیں) اور بعض کا اخلاق قومی ہوتا ہے؛ جیسا کہ اہل یورپ فقط اپنی قوم کے لئے اخلاقی اصول و اقدار کے پابند ہوتے ہیں... لیکن آیا خداشناسی اور معرفت الٰہی کے بغیر بھی اخلاقی اصول و اقدار کے لئے کوئی منطق (Logic) فراہم کی جا سکتی ہے؟ نہیں!... اگر ایمان نہ ہو تو اخلاق کی مثال اس کرنسی نوٹ کی سی ہے جس کے پیچھے زر، ذخیرہ نہ ہو''۔۴۲؎

اگر زمانۂ حاضر کی عالمی سیاست اور حالات پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو شہید کی یہ بات سو فیصد ٹھیک نظر آتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آج اہل یورپ دہرے اخلاقی اقدار کے قائل ہیں۔ ان کا کُتا بھی مار ڈالا جائے تو اخلاقی جرم و خطا قرار پاتا ہے، لیکن فلسطین، لبنان، عراق، افغانستان، کشمیر اور ایسے کئی مناطق میں ہزاروں بچے، بوڑھے، عورتیں اور بے گناہ نوجوان مار ڈالے جائیں تو اخلاقی اصول و اقدار پر کوئی آنچ نہیں آتی؟! وجہ یہی ہے کہ اُن کے اخلاق کی بنیاد دین اور خداشناسی پر نہیں ہے۔ یہاں ''تھامس آرنلڈ'' کی موت پر سید نذیر نیازی سے علامہ اقبال کے اس طرح کے جملات بھی قابل غور ہیں کہ یورپ میں ایک فرد کی زندگی فقط اس کے ملک کے لئے (Devoted) ہے....

اگر سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو نہ فقط ''آرنلڈ''، بلکہ ہر مستشرق کا علم وفضل وہی راہ اپناتا ہے جو یورپ کی ہوس استعمار اور بادشاہی پر جا کر ختم ہوتی ہے۔۔۴۳

ہم سمجھتے ہیں کہ دین واخلاق کے رابطے کا وہ نظریہ جو شہید مطہری نے پیش کیا لیکن وہ اپنی زندگی میں اس نظریہ کی ساری گتھیاں نہ سلجھا سکے، اس کی بہترین توضیح وتفسیر استاد محمد تقی مصباح نے پیش کی ہے۔ انھوں نے ''ہابز'' و''ہیوم'' اور ان کے پیروکاروں کو بڑا ہی عالمانہ جواب دیا ہے۔ ان کا دعوی یہ ہے کہ اخلاقی اصول واقدار کسی طور سے بھی ہماری پسند وناپسند سے وابستہ اور اعتباری نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر چہ اخلاقی مفاہیم، خواہ وہ اخلاقی احکام وقضایا کا موضوع قرار پائیں، جیسے عدالت، امانت، خیانت وغیرہ وغیرہ اور خواہ محمول قرار پائیں (جیسے نیکی، برائی، ٹھیک، غلط، چاہیے، نہ چاہیے اور فریضہ کے مفاہیم) ماہوی مفاہیم نہیں ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ یہ مفاہیم ایک خارجی اور عینی حقیقت کے بیان کرنے والے ہوں۔ بنأ برایں، ان مفاہیم اور ایسے ماہوی مفاہیم میں جنھیں ''معقولات اولیٰ'' کہا جاتا ہے (جیسے پانی، مٹی اور ہوا کا مفہوم کہ جو عینی اور عالم خارج کی اشیاء کا ذہنی تصور ہوتے ہیں) فرق پایا جاتا ہے؛ لیکن استاد مصباح کے بقول:

''اگر چہ یہ مفاہیم قراردادی اور خاص معنوں میں ...''اعتباری'' ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان مفاہیم کا عالم خارج کے حقائق سے کوئی رابطہ نہ ہو اور قانون علیّت کے دائرہ سے باہر ہوں۔ بلکہ انسان، کمال و سعادت تک پہنچنے کی ضرورت کے تحت ان مفاہیم کے ''اعتبار'' کی شناخت کرتا ہے اور اس کی یہ شناخت، دیگر شناختوں کی طرح بعض اوقات ٹھیک اور واقعیت کے مطابق ہوتی ہے۔۴۴ اور بعض اوقات خطا اور واقعیت کے مخالف ہوتی ہے۔۴۵ ..اگر یہ اعتباری مفاہیم لباس کے رنگ اور کھانے کی انواع کے پسند وناپسند اور سلیقہ کی طرح فقط فردی تمایلات کے آئینہ دار ہوتے تو کبھی اُن پر کسی کی مدحت یا مذمت نہ کی جاتی...''۔۴۶

بنأ برایں، آقائے مصباح کی نظر میں سچائی، عدالت اور امانت وخیانت جیسے اخلاقی مفاہیم، انسانی افعال واخلاق اور ان کے نتائج کے درمیان پائے جانے والے حقیقی روابط سے پردہ اٹھاتے ہیں؛ بالکل ایسے ہی جیسے پانی، مٹی اور ہوا کے مفاہیم بھی بعض حقائق عالم سے پردہ اٹھاتے ہیں؛ ہاں! اس فرق کے ساتھ کہ یہ مفاہیم فلسفہ ومنطق کی اصطلاح میں انتزاعی اور غیر ماہوی مفاہیم ہیں، جبکہ مٹی پانی اور ہوا کا مفہوم، ماہوی مفہوم ہے۔ جہاں تک اچھائی، برائی اور ان جیسے دیگر اخلاقی مفاہیم کا تعلق ہے (جو اخلاقی احکام میں اکثر مسند یا منطقی قضیہ میں محمول کے طور پر استعمال ہوتے ہیں) وہ بھی استاد مصباح کی نظر میں: ''انسان کے اختیاری افعال اور اخلاق کے مطلوبہ مقصد کے درمیان پائے جانے والے حقیقی رابطہ کو بیان کرتے اور ایک نفس الامری حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں''۔۴۷

بنائ برایں، استاد مصباح کے نظریے کے مطابق، اچھائی، برائی، خیر وشر، واجب وحرام اوران جیسے تمام اخلاقی مفاہیم، ''فلسفہ کے معقولات ثانیہ'' شمار ہوتے ہیں۔۴۸؎ اور جب ایسا ہے تو ان مفاہیم کی بنیاد پر برہان و استدلال بھی کیا جاسکتا ہے اورانہیں ایک منطقی قیاس و برہان کی شکل میں دینی تعلیمات سے اخذ بھی کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ''ہابز اور ہیوم'' اوران کے پیروکاروں کا یہ استدلال ٹھیک نہیں ہے کہ اخلاقی مفاہیم محض اعتباری مفاہیم ہوتے ہیں اورانھیں نہ کسی ضابطہ کے تحت لایا جاسکتا ہے نہ دینی تعلیمات وحقائق سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ استاد مصباح نے بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا کہ اخلاقی مفاہیم اخباری مفاہیم ہیں اور نفس الامری حقائق ہی سے پردہ اٹھاتے ہیں۔لیکن بعض دانشوروں کے خیال میں اُن کے اس بیان اوراستدلال کی مزید تکمیل ممکن ہے۔اس حوالے سے ہمارے استاد صادق لاریجانی کا نظریہ، یہ ہے کہ استاد مصباح کا یہ دعوی کہ اخلاقی احکامات اوراقدار (''چاہیے''، ''نہ چاہیے'') انسانی فعل اوراس کے نتیجہ کے درمیان پائے جانے والے واقعی رابطہ کو بیان کرتے ہیں، ٹھیک نہیں ہے۔ان کا دعوی یہ ہے کہ اخلاقی اصول واقدار، فعل اوراس کے نتیجہ کے درمیان نہیں بلکہ فعل اور فاعل کے درمیان پائے جانے والے رابطہ کے بیان کرتے ہیں۔۴۹؎

استاد لاریجانی کی نظر میں استاد مصباح کے نظریے کی تکمیل اس طرح ممکن ہے کہ ہم جہاں یہ کہتے ہیں کہ فعل اوراس کے نتیجے کے درمیان رابطہ پایا جاتا ہے وہاں یہ بھی کہیں کہ اخلاقی اقدار اور ''چاہیے''، ''نہ چاہیے'' کے مفاہیم، اصطلاحاً ''ضرورت بالقیاس اورضرورت بالغیر'' ہیں۔دوسرے الفاظ میں ''چاہیے''، ''نہ چاہیے'' کا مفہوم انسانی فعل اوراس کے نتیجے کو بیان نہیں کرتا ہے بلکہ فعل کے فاعل سے صادر ہونے کی حیثیت کو بیان کرتا ہے۔ ہاں فعل اورفعل کے نتیجے پران مفاہیم کی دلالت التزامی ہوتی ہے۔۵۰؎

خلاصہ یہ کہ اگرچہ استاد لاریجانی نے استاد مصباح کے دعوی کی دلیل پر اشکال کیا ہے لیکن اپنے ایک مخصوص بیان کے ذریعے ان کے اصل دعوی کی تائید کی ہے اورقبول کیا ہے کہ اخلاقی مفاہیم، بہرحال، نفس الامری حقائق کے درمیان پائے جانے والے واقعی روابط کو بیان کرتے ہیں اور جب ایسا ہے تو اخلاقی اقدار واحکام کو دینی تعلیمات سے اخذ بھی کیا جاسکتا ہے۔

منابع اورحواشی

۱۔جعفری، محمد تقی، اخلاق ومذہب، انتشارات تشیّع، قم، ۱۳۵۴ھ، ش؛ ص ۱۵۔

۲۔مصباح، محمد تقی یزدی، فلسفۂ اخلاق، تحقیق ونگارش احمد حسین شریفی، چاپ اول، چاپ ونشر بین الملل؛ ۱۳۸۱، ص

۱۶۵۔
۳۔ ماریہ سید قریشی نے اپنی کتاب ''دین واخلاق''، چاپ اول، قم، بضعۃ الرسول، انجمن معارف اسلامی ایران، ۱۳۸۱ھ ش، کے ص ۱۴ پر ان نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔
۴۔ المجلسی، بحار الانوار، مؤسسۃ الوفا، بیروت، لبنان، الطبع الثانیۃ، ۱۴۰۳؛ ج ۱۶، ص ۲۱۰؛ داؤد بن سلیمان الغازی، مسند الرضا، الطبعہ الاولیٰ، مرکز النشر الاسلامی، ۱۴۱۸؛ ص ۱۳۱۔
۵۔ الحر العاملی، وسائل الشیعہ، ج ۱۲، مؤسسۃ آل البیت لاحیاء التراث، ۱۴۱۴ق، قم، ص ۱۷۴؛ المیرزا النوری، مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل، ج ۱۱، الطبعہ الثانیہ، مؤسسہ آل البیت لاحیاء التراث، ۱۴۰۸ق، ص ۱۹۱؛ الشیخ الطّوسی، الامالی، چاپ اول، دار الثقافہ، قم، ۱۴۱۴ق، ص ۴۷۸؛ المجلسی، بحار الانوار، ج ۶۶، ص ۳۷۵۔
۶۔ الصحیفۃ السجادیۃ للامام زین العابدین، چاپخانہ دفتر انتشارات اسلامی، صص ۱۰۱ تا ۱۰۴۔
۷۔ والتر ترنس استیس، دین ونگرش نوین، ترجمہ احمد رضا جلیلی، انتشارات حکمت، چاپ دوم، ۱۳۷۱، ص ۸۳۔
۸۔ فردریک کاپلستون، تاریخ فلسفہ، ترجمہ: امیر جلال الدین اعلم، انتشارات سروش، چاپ سوم، ۱۳۷۵، ج ۵، ص ۱۸۸۔
۹۔ Is
۱۰۔ Ought
۱۱۔ آملی، جوادی، دین شناسی، تحقیق وتنظیم: محمد رضا مصطفیٰ پور، چاپ اول، مرکز نشر اسراء، ۱۳۸۱ھ ش، قم، صص ۲۷۔ ۲۸۔
۱۲۔ بہشتی، ڈاکٹر احمد، فلسفۂ دین، چاپ اول، بوستان کتاب، ۱۳۸۲ھ ش، قم، ص ۳۴۔
۱۳۔ مقدمہ کتاب فلسفہ دین از محمد تقی جعفری، (دفتر نخست) چاپ اول، مؤسسہ فرہنگی اندیشہ، قم، ۱۳۷۵ھ ش، ص ۱۷۔
۱۴۔ جیمز، ویلیام، دین وروان، ترجمہ: مہدی قائنی، چاپ اول، تہران، بنگاہ ترجمہ ونشر، ۱۳۴۳ھ ش، ص ۶۳۔
۱۵۔ آملی، جوادی، دین شناسی، ص ۱۸۹۔
۱۶۔ زنجانی، میرزا ابو طالب، کیمیای سعادت، ترجمہ طہارۃ الاعراق از ابو علی مسکویہ رازی، چاپ اول، نشر میراث مکتوب، ۱۳۷۵ھ ش، ص، ۵۷۔
۱۷۔ کاشانی، ملا محسن فیض، اخلاق حسنہ، ترجمہ: محمد باقر ساعدی، انتشارات پیام آزادی، چاپ دہم، ۱۳۶۹ھ ش،

تہران،ص۹۔

۱۸۔ویلیام.کی.فرانکنا،فلسفۂ اخلاق،ترجمہ ہادی صادقی،مؤسسہ فرہنگی طہ،چاپ دوم،۱۳۸۳،ھ،ش،تہران،صص ۲۸۔۲۹۔

۱۹۔نورمن.ایل.گیسلر،فلسفۂ دین،ج۱،ترجمہ،حمید عنایت اللہی،چاپ اول،انتشارات حکمت،۱۳۷۵ھ،ش، تہران،ص۲۳۔۲۴

۲۰۔فصلنامہ رہنمون،فلسفۂ اخلاق کا خصوصی ایڈیشن،شمارہ سوم و چہارم،۱۳۸۳ھ،ش،ص۹۹؛بنقل از:

David B. Wong, (1984), Moral Ralativity California University of California Press. p. 38

۲۱۔اسدی،محمد رضا،مقدمہ کتاب ''فلسفۂ دین'' (دفتر نخست) ص ۴۷۔

۲۲۔انعام/۵۹۔

۲۳۔طباطبائی،محمد حسین،تفسیر المیزان،اسی آیت کے ذیل میں۔

۲۴۔انعام/۱۵۴۔۱۵۵۔

۲۵۔نحل/۸۹۔

۲۶۔المیزان،ج۱۲،اسی آیت کے ذیل میں۔

۲۷۔اسراء/۱۲۔

۲۸۔دورۂ آثار افلاطون،ترجمہ:محمد حسن لطفی و رضا کاویانی،شرکت شہامی انتشارات خوارزمی،۱۳۷۵ھ،ش،ج ۲، ص ۲۴۸۔

۲۹۔کاپلستون،فردریک،تاریخ فلسفہ،ترجمہ:امیر جلال الدین اعلم،انتشارات سروش،چاپ سوم،۱۳۷۵ھ،ش،ج ۵،ص۴۲؛بنقل از:لویاتان،۳،ص۴۔

۳۰۔ایضا۔

۳۱۔ دیکھئے:مایکل پیترسون وہمراہان،عقل واعتقاد دینی،مترجم احمد نراقی وابراہیم سلطانی،انتشارات طرح نو، صص ۴۴۹۔۴۵۰۔

۳۲۔دیکھئے:کاپلستون،تاریخ فلسفہ،ج۵،صص ۱۴۰۔۱۴۳۔

۳۳۔دیکھئے:فرانکنا،فلسفۂ اخلاق،صص ۲۹۔۳۰۔

۳۴۔ دیکھئے: والتر ترنش استیس، دین ونگرش نوین، صص ۵۵۔۵۶ و ۱۷۴۔۱۸۵۔

۳۵۔ سروش، یادنامہ شہید مرتضی مطہری، مقالہ جاودانگی و اخلاق، سازمان انتشارات آموزش انقلاب اسلامی، ۱۳۶۰ھ،ش، تہران، ص ۳۹۱۔

۳۶۔ مطہری، مرتضی، فلسفۂ اخلاق، چاپ ششم، انتشارات صدرا، ۱۳۶۷ھ،ش، ص ۲۴۲۔

۳۷۔ مطہری، مرتضی، مقدمہ ای بر جہان بینی اسلامی، ج ۲، انتشارات صدرا، ۱۳۷۲ھ،ش، صص ۵۔۶

۳۸۔ مطہری، مرتضیٰ، انسان وایمان، مجموعۂ آثار، ج ۲، انتشارات صدرا، ص ۴۰۔

۳۹۔ مطہری، مسئلہ شناخت، انتشارات صدرا، ۱۳۷۳ھ،ش، صص ۱۳۔۱۵

۴۰۔ طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ذیل آیات سورہ نسأ، ۷۹۔۸۰ اور اصول فلسفہ و روش رئالیسم، ج ۲، انتشارات صدرا، چاپ ہفتم، ص ۲۰۴۔

۴۱۔ اصول فلسفہ وروش رئالیسم، ص ۱۴۳۔

۴۲۔ مطہری، فلسفہ اخلاق، ص ۲۸۶۔

۴۳۔ سید نذیر نیازی، مکتوبات اقبال، چاپ اول، لاہور، اقبال آکادمی کراچی، ۱۹۷۵ء۔

۴۴۔ مثال کے طور پر انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کمال وسعادت کے حصول کے لئے سچائی کا دامنا تھامنا چاہیے اور حقیقت میں بھی کمال وسعادت کے حصول کا ذریعہ سچائی ہوتا ہے۔

۴۵۔ مثال کے طور پر ایک انسان یہ تصور کرتا ہے کہ سعادت پانے کا راستہ چاپلوسی اور جھوٹ میں پوشیدہ ہے لیکن حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔

۴۶۔ مصباح، محمد تقی، فلسفۂ اخلاق، انتشارات مؤسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی؛ ۱۳۸۱ھ،ش قم، ص ۳۸۔

۴۷۔ مصباح، محمد تقی، آموزش فلسفہ، شرکت چاپ ونشر بین الملل، چاپ ہفتم، ج ۱، تہران، ص ۲۰۷۔

۴۸۔ مصباح، محمد تقی، اخلاق در قرآن، تحقیق ونگارش محمد حسن اسکندری، موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی، چاپ ہفتم، ۱۳۸۰ھ،ش، ج ۱، ص ۵۱۔

۴۹۔ معلّمی، حسن، مبانی اخلاق (در فلسفۂ غرب وفلسفہ اسلامی) مرکز نشر فرہنگ واندیشۂ اسلامی، چاپ اول، ۱۳۸۰، تہران، ص ۲۲۱۔

۵۰۔ مقالے کے اختصار کے سبب ہم اس بحث کا یہاں حق ادا نہ کر سکنے پر معذرت خواہ ہیں۔ مزید مطالعہ کے لئے دیکھیے:

۱) معلّمی، حسن، مبانی اخلاق (درفلسفۂ غرب وفلسفہ اسلامی) مرکز نشر فرہنگ واندیشۂ اسلامی، چاپ اول، ۱۳۸۰، تہران، صفحات ۲۲۱ تا ۲۲۴؛
۲) روزنامہ افق حوزہ، سال پنجم، شمارہ ۱۴۴، ۱۳۸۶ھ ش، قم، ص ۴۔
۵۱۔ مولی صالح مازندرانی، شرح اصول کافی، ج ۸، ص ۲۹۔
۵۲۔ جلال الدین السیوطی، ''تنویر الحوالک''، ص ۶۵۳۔
۵۳۔ امام مالک، کتاب الموطا، چاپ بیروت، ۱۴۰۶، ص ۹۰۴۔
۵۴۔ امام احمد بن حنبل، مسند، چاپ بیروت، ص ۳۸۱۔

مذہبی رواداری

مولانا جلال الدین رومی اور ابوسعید ابوالخیر کی نظر میں

ڈاکٹر محمد علی خالدیان (آزاد یونیورسٹی گرگان کی علمی کمیٹی کے ممبر)
مترجم: عون علی جاڑوی

خلاصہ

قرآن کریم کی آیات اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ''مذہبی رواداری'' پر دلالت اور تاکید کرتی ہیں. قرآن کریم میں تین قسم کی آیات موجود ہیں جو مخالف ادیان اور مذاہب کے ساتھ رواداری برتنے کی طرف رہنمائی کرتی ہیں: الف) وہ آیات جو عقیدہ کی تبدیلی میں زبردستی اور جبر کی نفی کرتی ہیں؛ ب) وہ آیات جو غیر مسلمانوں کے ساتھ دوستی اور احسان کے ساتھ پیش آنے کی ترغیب دلاتی ہیں؛ ج) وہ آیات جو دوسرے ادیان کے ساتھ رواداری کے ساتھ پیش آنے پر تاکید کرتی ہیں.

نصاریٰ اور یہود کے ساتھ برتاؤ میں حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور خلفاء کی عملی سیرت، صلح اور محبت پر مبنی تھی اور وقت کے حکمرانوں کے ساتھ معاہدوں میں عقیدہ کی آزادی، ان کو اپنی مخصوص عبادتگاہیں رکھنے اور ان کی تعمیر اور مرمت کے حق پر صراحت سے تاکید کی گئی ہے.

دوسری طرف، حکماء اور عرفاء کے آثار میں گفتگو اور تبادلہ خیال کی منطق کی ترویج

سے اور مذہبی تعصّبات اور قومی اور نسلی اختلافات کو چھوڑ کر، ''انسانیت''، ''معرفت''، ''صلح''، ''عشق''، ''آزادی'' وغیرہ... جیسے مفاہیم کو آگے لانے سے، مذہبی رواداری کے پہلے سے زیادہ مواقع فراہم ہوئے ہیں.

اس مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ مذہبی رواداری کی ترویج میں عرفاء کے کردار کو نمایاں کیا جائے اور بعض صاحب دل عرفاء کے کلام اور ان کی عملی سیرت کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے، یہ دکھایا جائے کہ دنیا کو اختلاف اور دوگانگی سے عاری بھی تصور کیا جا سکتا ہے، اور یہ تاکید کی جائے کہ اس معرفت کو برباد کر دینے والے اختلافات اور تعصّبات کا نتیجہ، اللہ تعالی، معنویت اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوری کے علاوہ کچھ نہیں ہے.

کلیدی کلمات: مذہبی رواداری، ادیان، مذاہب، صلح، عقلانیت، آزادی، عدالت، تعصّبات سے دوری، گفتگو، شناخت

''مذہبی رواداری''، اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے جس پر قرآن کریم نے اپنی متعدد آیات میں مختلف طریقوں سے تاکید کرتے ہوئے مکمل صراحت کے ساتھ اس کی سفارش کی ہے اور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے، جب پوری انسانیت ابھی ''مذہبی رواداری'' کے معنی سے بھی انجان تھی، اس کو پوری طرح پہچان کر مسلمان قوم کو اس کی طرف دعوت دی. جس طرح بعض دوسرے مذاہب کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے اور عیسائیت کی صلیبی جنگوں کی طرح، اسلام میں ''مذہبی جنگ'' کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا. دوسرے ادیان اور مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ ضدیت اور عناد رکھنا منع ہے اور ان کے ساتھ توہین آمیز رویہ رکھنا، دینی لحاظ سے پسندیدہ روش نہیں ہے. اسلام میں دوسرے مخالف ادیان اور مذاہب کے ساتھ رواداری کی بنیاد ڈالنے کے لئے کئی طریقے رکھے گئے ہیں. یہاں پر قرآن کریم کی تین قسم کی آیات بیان کی جارہی ہیں: پہلی قسم کی آیات؛ عقیدہ کی تبدیلی میں اکراہ اور اجبار کی نفی کرنے والی آیات. قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے: ''**لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی** (بقرہ/۱۳۳)؛ دین میں اکراہ اور زبردستی نہیں ہے. سعادت اور کمال کا راستہ، گمراہی اور ضلالت سے الگ اور واضح کر دیا گیا ہے''. دوسری قسم کی آیات: غیر مسلمانوں کے ساتھ محبت اور احسان کرنا. یہ آیات مسلمانوں کے لئے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ سلوک کرنے کا طریقہ بیان کر رہی ہیں. ان آیات

میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ نہ صرف غیر مسلمانوں کو عداوت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے بلکہ ان سے محبت اور ان کے ساتھ احسان کیا جائے:

﴿ لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوا کم فی الدین و لم یخرجوکم من دیارکم ان تبروهم و تقسطوا الیهم، ان الله یحب المقسطین ● انما ینهاکم الله عن الذین قاتلونکم فی الدین و اخرجوکم من دیارکم و ظاهروا علی اخراجکم ان تولوهم و من یتولهم فاولئک هم الظالمون ﴾ (ممتحنہ/۸،۹)

''اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ان لوگوں کے ساتھ دوستی رکھنے سے منع نہیں فرماتا، جن لوگوں نے تمھارے ساتھ دشمنی اور جنگ نہیں کی ہے اور تم کو اپنے گھروں سے باہر نہ نکال دیا ہو، تاکہ تم ان سے بیزاری اور نفرت کریں، بلکہ ان کے ساتھ عدالت اور انصاف کے ساتھ برتاؤ کرو. کیونکہ اللہ تعالیٰ عدالت اور انصاف کرنے والوں کو بہت دوست رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم کو صرف ان لوگوں کی دوستی سے منع فرماتا ہے جنھوں نے دین کے معاملہ میں تمھارے ساتھ جنگ کی ہو اور تم کو اپنے وطن سے آوارہ کر دیا ہو اور اس کام پر ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو گئے ہوں. ان کے ساتھ دوستی کرنے سے پرہیز کرو اور تم میں سے جو لوگ بھی ان کے ساتھ دوستی کریں گے، وہ حقیقت میں ستمگار اور ظالم ہوں گے''

تیسری قسم کی آیات: دوسرے ادیان کے ساتھ رواداری پر تاکید کرتی ہیں. قرآن کریم میں کچھ آیات ایسی ہیں جو اہل کتاب (یہود، نصاریٰ اور زرتشت) کے ساتھ بحث اور مناظرہ کرنے کے بارے میں ہیں. ان آیات میں ان لوگوں کے ساتھ بحث کرتے ہوئے تعقل اور منطقی طریقوں کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے. ان آیات میں اصلی مقصد انسان کے ضمیر کو اندرونی طور پر لاجواب کر دینا ہے. وہ بھی بہترین اور موثر ترین طریقوں سے جن میں دینی تعصّبات سے اٹھنے والے تشدد اور خشونت کی کوئی گنجائش نہیں ہے. قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿و لا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی هی احسن ﴾ (عنکبوت/۴۶)

''اہل کتاب کے ساتھ بہترین اور مؤثر طریقوں کے علاوہ (کسی اور طریقہ سے) بحث اور مناظرہ نہ کرو''

غالباً ایسی دعوت میں جو منطق کی نورانیت اور جذابیت سے خالی ہوں اور، اس میں خوف اور دھمکیاں ہوں، مزید اختلاف اور شگاف ڈالنے کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا انجام نہیں ہوتا؛ اسی وجہ سے اسلام نے اس راستہ کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا ہے، اور اس کے برعکس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں غیر مسلمانوں کے ساتھ صلح پسندانہ اور انسانی سلوک بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے. حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجرانی عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہے، اس میں ان کی مذہبی آزادی کا خیال رکھا گیا ہے ''کسی بھی پادری یا کسی زاہد کو اپنے کلیسا سے باہر نہیں نکالا جائے گا. ان پر کوئی چیز بھی تحمیل یا ان کی توہین نہیں کی جائے گی اسی طرح ہمارے سپاہیوں کو اجازت نہیں ہوگی کہ ان کی زمینوں پر قبضہ کریں. جو لوگ انصاف کے خواہاں ہوں گے ان کو انصاف ملے گا'' روایت میں ملتا ہے کہ جب نجران کے نصاریٰ، آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے اپنی عبا کو ان کے لئے زمین پر بچھا دیا اور ان سے گزارش کی کہ اس عبا پر بیٹھیں. جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں: [ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے] اسی وقت قریب سے ایک جنازہ گزارا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے احترام کی خاطر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، ہم نے بھی ایسا ہی کیا؛ اس کے بعد ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا یہ جنازہ ایک یہودی کا نہیں تھا؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں! کیوں نہیں! لیکن کیا یہودی انسان نہیں ہوتے. ہم ایک انسان کے احترام کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے. (اسلام اور عالمی صلح، ص ۲۵۰)

حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے، خلفائے راشدین بھی، غیر مسلمانوں کے ساتھ مسالمت آمیز رویہ رکھتے تھے. ان میں سے ایک چھوٹی سی مثال وہ ہے جب حضرت علی علیہ السلام نے ایک عیسائی کمزور بوڑھے کی مدد فرمائی تھی. حضرت علی علیہ السلام نے راستہ سے گذرتے ہوئے ایک ناتوان اور کمزور بوڑھے کو دیکھا جو بھیک مانگ رہا ہے. دریافت فرمایا کہ یہ بوڑھا شخص کون ہے؟ عرض کی گئی کہ یا امیر المؤمنین! یہ ایک عیسائی ہے. حضرت علی علیہ السلام نے غصہ کی حالت میں فرمایا: ''جب یہ بوڑھا شخص کام کرنے کے قابل تھا، اس وقت اس سے کام لیتے رہے، اور اب جب اس میں کام کرنے کی طاقت نہ رہی تو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے، اس کی زندگی اور معاش کے اخراجات کو مسلمانوں کے بیت المال سے ادا کیا جانا چاہئے'' (وسائل الشیعہ، کتاب الجہاد، انیسواں باب)

آزادی عمل کا ایک اور نمونہ وہ معاہدہ ہے جو دوسرے خلیفہ نے ایلیا (بیت المقدس) کے عیسائی عوام کے ساتھ باندھا تھا. یہ معاہدہ مذہبی رواداری پر یوں تصریح کرتا ہے: ''بسم الله الرحمن الرحيم. یہ امان نامہ، اللہ

کے صلیبیوں، ان کے بیماروں اوران کے تندرستوں اوران کی دوسری اقوام کوامان دی ہے.اس امان نامہ کے تیئں ان کے کنیسوں پر قبضہ نہیں کیا جائے گا اوران کنیسوں اوران کے اطراف اوران کے صلیبیوں اورعوام کے مال سے کچھ بھی نہیں لیا جائے گا اور کسی بھی یہودی کوحق نہیں ہے کہ ''ایلیا'' کے مکینوں کے گھروں میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرے اور بالمقابل اس معاہدہ کی رو سے ایلیا کے لوگوں کو، دوسرے شہروں کی طرح، جزیہ دینا ہوگا اور رومیوں اور چور، ڈاکوؤں کو وہاں سے باہر نکالنا ہوگا؛ جو بھی اپنے شہر سے باہر جائے گا وہ حفظ وامان میں ہوگا جب تک کہ اپنے مامن اور مقصد تک نہیں پہنچ جاتا.ایلیا کے مکینوں میں سے بھی جو شخص رومیوں کے ساتھ جانا چاہے اور اپنے اموال اور صلیبیوں کو ساتھ لے جانا چاہے، اس کی جان، مال اور اس کا صلیب حفظ وامان میں ہوگا جب تک کہ وہ اپنے مقصد تک نہیں پہنچ جاتا'' (طبری، ج ۵، ص ۲۴۶)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے ساتھ جو معاہدے کیے ہیں، ان میں بھی عقیدہ کی آزادی، مذہبی تیوہاروں کی آزادی اوران کو اپنی مخصوص عبادتگاہیں رکھنے اوران کی تعمیر اور مرمت کے حق پر صراحت سے تاکید کی گئی ہے.سنہ دو ہجری میں جو معاہدہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرزمین سینا کے عیسائیوں کے ساتھ کیا تھا جس کو حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے کتابت فرمایا تھا، اس میں مذہبی رواداری بہت واضح طور پر نظر آتی ہے: ''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے راہب اور پادری کو تبدیل نہیں کریں گے اور ترک دنیا کرنے والوں کو ان کی عبادت گاہوں سے نہیں نکالیں گے، اور مسافروں کو سفر پر جانے سے نہیں روکیں گے، اوران کے کلیسوں سے کوئی بھی چیز اٹھا کر اپنی عمارتوں اور اپنی مساجد کے لئے نہیں لائیں گے'' (ابن عبدربہ، ج ۱، ص ۸۰)

عظیم مسلمان مفکر سید قطب نے مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ عمر بن خطاب کے اس یہودی شخص کے ساتھ رویہ کے بارے میں یوں لکھا ہے: ''دوسرے خلیفہ نے ایک پریشان حال بوڑھے کو دیکھا جو بھیک مانگ رہا ہے اور دوسروں سے امداد طلب کر رہا ہے. پتا چلا کہ وہ یہودی ہے.خلیفہ نے اس سے پوچھا: کس چیز نے تمہیں اس کام پر مجبور کر دیا ہے؟ اس نے جواباً عرض کی: جزیہ دینا اور ضرورت اور بڑھاپے نے.خلیفہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کو اپنے ساتھ، گھر میں لے گئے اور اتنا سب کچھ اس کو عطا کیا جو اس کی ضرورت کو پورا کر سکتا تھا؛ پھر اس کو بیت المال کے خزانہ دار کے پاس بھیجا اور اس کو حکم دیا کہ اس بوڑھے شخص کا اور اس جیسے دوسرے بوڑھوں کا خاص خیال رکھنا. میں اللہ تعالی کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ اگر ہم جوانی میں ان سے کام لیتے رہیں لیکن بڑھاپے میں ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں گے تو ہم نے عدالت اور انصاف نہیں کیا ہے'' (اسلامی تہذیب کی تاریخ، ج ۴، ص ۱۷۴، کریمی

نیا،مجلّہ تبیان،ص/۲۸،۲۹،۳۰،۳۱،۳۳) لہٰذا دین اسلام، رحمت، شفقت اور استدلال و منطق کا دین ہے، نہ کہ تلوار اور زبردستی کا دین. ہاں البتہ صرف اس وقت جب منطق اور تعقل سے کام آگے نہ بڑھ رہا ہو اور مقابلہ کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ باقی نہ رہے؛ تو کہنا چاہئے کہ دین اسلام جو آسمانی دینوں میں سب سے زیادہ نورانی اور ترقی یافتہ دین ہے، حقیقت کے دشمنوں اور حق سے عناد رکھنے والوں کے ساتھ برتاؤ کے دو طریقہ رکھتا ہے: ایک تلوار کے ساتھ مقابلہ اور دوسرا بحث اور گفتگو اور تبادلہ خیال کرنا.

پہلا طریقہ پرانے زمانوں میں اور روایتی دنیا میں جہاں پر ثقافت و تہذیب اور علمی و انسانی روابط نہیں تھے، سب سے زیادہ عملی ہوتا تھا. پہلا طریقہ صرف وقتی طور پر ''عمومی صلح اور حقیقت کو پھیلانے'' میں مفید ہوا کرتا تھا. وہ عقیدہ جو تلواروں کی چکا چک اور نیزوں کی تیزانیوں سے لوگوں پر ٹھونس دیا جائے، کبھی بھی ایک قوم کی بیداری اور اس میں شعور اور انسانوں کی تربیت کا کام نہیں دے سکتا اور اس سے استعداد اور خلاقیت پیدا نہیں ہوتی؛ بلکہ لوگوں کو اندھی تقلید کے مرحلہ میں ہی روکے رکھے گا. بغیر کسی شک و تردید کے اسلامی رہبر اور دانشور حضرات، پوری اسلامی تاریخ میں علم و روشنگری کی مشعل جلاتے رہے ہیں انھوں نے اور اس چمکتے ہوئے نبوی راستہ میں بہت مشکل کشائی کی ہے اور آیات الٰہی و مشکل دینی مفاہیم کی واضح تفسیر پیش کرتے چلے آئے ہیں. اس سلسلہ میں مختلف ادیان کے علماء کا حضرت امام رضا علیہ السلام کے ساتھ علمی مناظرہ قابل ذکر ہے. موجودہ بحث کے بارے میں اس وقت کے بہت عظیم متکلم ''عمران صابی'' کا آپؑ کے ساتھ مناظرہ، بہترین نمونہ ہے جس نے بڑی بحث کے بعد، آخر میں اللہ تعالیٰ اور اسلام کی حقانیت کا اعتراف کیا ہے. آج ہمارا معاشرہ بہت سے سوالوں کی زد میں ہے جن کا اکثر و بیشتر حصہ فکری اور اعتقادی مسائل سے متعلق ہے اور ہمارا ذہن بھی ایک شاہراہ کی طرح ہے جس سے ہر روز نئی نئی طرز فکر اور ان کے شبہات اور اسی طرح نئے اور پرانے سوال و جواب گذرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ذہن کے ایک حصہ کو اپنے لپیٹ میں لے لیتے ہیں. ایسا لگتا ہے کہ موجودہ سوالوں اور شبہوں کو جواب دینے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ قرآن کریم اور اسلامی علوم کی مستحکم منطق پر استوار علمی اور مستدل دفاع کیا جائے. بحث اور گفتگو کے ذریعہ کسی بھی حقیقت کی پیاس رکھنے والے کو سیراب کیا جا سکتا ہے اور اس کی عطش کو دور کیا جا سکتا ہے؛ لیکن دوسرا طریقہ، عوام کی تربیت، ان کی خلاقیت کو ابھارنے، ان کی زندگی کی امنگوں کو بڑھانے، ہنر کو پروان چڑھانے اور تہذیب کی تکوین میں زیادہ مؤثر رہا ہے اور اس دعوے کے تصدیق کے لئے تاریخ سچی گواہ ہے. موجودہ زمانہ جو ٹیکنالوجی اور ارتباطات کا زمانہ کہلاتا ہے اور جس کے بارے میں گلوبل ویلیج کی باتیں چل رہی ہیں، اس میں گفتگو، صلح پسندی اور تبادلہ خیال سے

نمایاں رہا ہے.

اس میدان میں آگے آنے والے دو سورما، ایک شیخ ابوسعید ابوالخیر اور دوسرے حضرت مولانا جلال الدین رومی ہیں. مولانا جلال الدین ''دینی حیات'' کی تعمیر نو کے معمار اور ''انسانی حیثیت'' کو زندہ کرنے والے جنھوں نے ''انسانیت''، ''معرفت''، ''صلح'' اور ''محبت'' کو اپنی فکر کی اصلی بنیاد بنایا ہے. آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک انسان تلقینی اور تقلیدی تفکرات کی اسارت سے چھٹکارا حاصل نہیں کرے گا، تب تک وہ حریت اور انسانی آزادی تک نہیں پہنچ سکتا. مولانا کی نظر اور آپ کے عرفان میں، جو چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ خود ''انسان'' ہے نہ کہ اس کے عقائد یا اس کے عہدہ و منصب؛ کیونکہ انسان ہی تو پورے عالم وجود کا مرکزی نقطہ اور اس کا فلسفہ وجودی ہے. مولانا جلال الدین، انسان کو اصالت دینے کے بعد، انسان کی معرفت پر توجہ کرتے ہیں؛ کیونکہ بشری تکامل کو حاصل کرنے کے لئے معرفت ہی زینہ ہے اور انسان کو حضرت حق کی تجلی کا نمونہ بنا سکتی ہے. معرفت رکھنے والے انسان اور تاریخ کی عظیم ہستیاں ہی تھیں جو تکامل کی تحریک کے علمبردار تھے اور انھوں نے ہی لوگوں کے وجود میں صداقت، محبت، ایثار، عشق اور حقیقت پرستی کا دانہ بویا ہے؛ لہذا، حضرت مولانا رومی اور ابوسعید ابوالخیر کی نظر میں بہت سے عوامل ادیان کی گفتگو میں مؤثر ہو سکتے ہیں جن میں سے سرفہرست ''معرفت'' اور ''آزادی'' کا نام لیا جا سکتا ہے؛ کیونکہ معرفت آزادی کا رابطہ، سورج اور سورج مکھی کے پھول کی طرح کا ہے جو ہمیشہ سورج کی طرف رخ کئے رکھتا ہے. معرفت بھی آزادی کے گرد ہی گھومتی ہے. مولانا رومی کا ارشاد ہے:

فرع دید آمد عمل بی هیچ شک　　پس نباشد مردم الا مردمک

(مثنوی معنوی، ۱۳۶۰ھ، دفتر اول، بیت نمبر ۱۶۷۹)

تمام انسانی اعمال کا اصلی مقصد یہی ہے کہ بزرگ ہستیوں کے ارشادات کے روشنی میں وہ معرفت حاصل کی جائے، کیوں کہ وہ خود اس دید اور شہود کا مرکزی نقطہ ہیں. یہ بزرگ ہستیاں، عالم وجود میں، انسان کی آنکھ کی پتلی کی طرح ہیں؛ البتہ معرفت، ایسا ملکہ اور ایسا گوہر ہے جو صفاتی فنا کے بعد حاصل ہوتا ہے؛ جس طرح پانی، جب تک وہ پانی کی صفات کو چھوڑے گا نہیں تب تک بھاپ نہیں بن سکتا. معرفت رکھنے والا انسان جو خود شناسی کی منزل پر فائز ہے، اپنے آپ کو تلقینی اور تقلیدی تفکرات کی اسارت سے نجات دلا کر اندرونی اور بیرونی حریت اور آزادگی کو حاصل کر چکا ہے. خلقت کا اصلی مقصد بھی اس قسم کے کامل انسانوں کو منتخب کرنا ہے. جنھوں نے ہر زمانے اور ہر دور میں اپنی رسالت اور اپنے ارشادات کی وجہ سے انسانیت کے کاروان کو تکامل کی راہ پر گامزن کیا ہے. ایسی ہستیوں نے، کثرت کی جھاگ کو ایک طرف ہٹا کر، وحدت اور توحید کے صاف و شفاف پانی تک رسائی حاصل کی ہے اور

ظاہر پسندی کو چھوڑ کر عالم ہستی کے مرکزی وجود تک جو وجود مطلق اور جان جہان اور جہان جان ہے، جا پہنچے ہیں. یہاں پر عین القضاۃ ہمدانی فرماتے ہیں:

آنکس که هزار عالم از رنگ نگاشت

رنگ من و تو کجا خرد ای ناداشت

این رنگ همه هوس بود یا پنداشت

او بی رنگ است رنگ او باید داشت

(عین القضاۃ ہمدانی، ۱۳۷۳، ص ۲۲)

لہٰذا، اس ''سوچ اور فکر سے مولانا جلال الدین رومی نے نظریوں اور مذاہب کی جنگوں کو ختم کر دیا ہے۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ اس قسم کی جنگوں کی بنیاد معرفت کی کمی اور سطحی افکار ہیں جو ممکن ہے کسی شریعت پر چلنے والے، عارف یا حکیم کے سوچ میں پائے جاتے ہوں. ان اختلافات کا تعلق عرفانی سیر وسلوک کے احوال اور حکمت وفلسفہ کو حاصل کرنے کے ابتدائی مراحل سے ہے؛ لیکن اگر واقعیت کو گہری نظر سے دیکھیں تو عقل کا جوہر اور فلسفی برہان بھی قلبی شہود اور باطنی عرفان کے نور کی جھلک ہے اور انسان اپنے تکامل اور معرفت کے درجوں کو ارتقاء دینے کی راہ میں اس مقام تک پہونچ جاتا ہے جہاں پر برہانی استدلالات اور کلاسوں میں بیٹھ کر سیکھے ہوئے وجدانی شہودات اور خانقاہوں میں حاصل کی ہوئی تعلیمات، گوہر مراد اور اصلی مقصود میں، یکجا ہو جاتے ہیں. اس وقت حکیم اور عارف میں کوئی اختلاف اور دوگانگی نہیں پائی جاتی، صرف اتنا فرق ہے کہ ایک اپنی تعلیمات پر اترائے گا اور دوسرا اپنے مشاہدات پر؛ چنانچہ کسی غرض ومرض سے خالی نظر میں بھی ایک صوفی اور ایک شریعت پر چلنے والے میں بعینہ یہی صورت حال دیکھی جاسکتی ہے جہاں پر ایک اپنے دیکھے ہوئے حالات کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جب کہ دوسرا اپنے سنے ہوئے حالات کے بارے میں. اسی طرح انسان اپنے علمی وروحانی تکامل میں بھی ایسے مقام اور ایسی منزلت پر فائز ہو جاتا ہے کہ اس کی نظر میں عالم وجود کی تکوینی کتاب کا جملہ جملہ اور حرف حرف، انبیاء اور اللہ تعالی کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی تشریعی کتاب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور یہ وہ حال اور وہ مقام ہے جہاں پر صوفی، شریعت والا، عارف اور فلسفی یکجا اکٹھا ہو جاتے ہیں اور یوں اسلامی مذاہب اور دوسری اقوام کے ادیان کے درمیان موجود جنگ، دشمنی اور دوگانگی ختم ہو کر صلح، صفا، دوستی اور یکرنگی آ جاتی ہے'' (ہمایی، ۱۳۵۴ش، ج ۱، ص ۴۲۱، ۴۲۲).

مولانا فرماتے ہیں:

صبغة الله هست خم رنگ هو　　پیس ها یک رنگ گردد اندر او

(مثنوی معنوی، ۱۳۶۰ش، دفتر دوم، بیت ۱۳۴۵)

جو قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے "صبغة الله و من احسن من الله صبغه و نحن له عابدون" (بقرہ/۱۳۷)؛ یہ اللہ تعالی کا رنگ ہے جس نے ہمیں ایمانی فطرت اور توحید کا رنگ دیا ہے. اللہ تعالی پر ایمان لانے سے زیادہ کوئی بھی رنگ خوش نما نہیں ہے اور ہم اس کی عبادت کرتے ہیں."

شیخ ابوسعید ابوالخیر بھی اس نظریہ میں مولانا جلال الدین کے ساتھ ہم عقیدہ اور ہم فکر ہیں اور آپ کا بھی عقیدہ یہی ہے کہ ان اختلافات کی اصلی جڑ، معرفت اور شناخت کا فقدان ہے. اور جب سب اپنے مقصود اور مطلوب تک پہونچیں گے تو وہاں پر یہی پائیں گے کہ حقیقت ایک ہی ہے اور ایک سے بڑھ کر نہیں؛ نتیجتاً توحید کی معرفت حاصل کر کے مختلف ادیان و مذاہب کے پیروؤں میں اختلافات اور دشمنیاں ختم ہو کر یہ سب ایک ہو سکتے ہیں" اور اس بارے میں صحیح تحقیق کو سمجھو، کیونکہ جب اس تحقیق کو صحیح طور پر سمجھ لو گے تو پھر کوئی شبہہ باقی نہیں رہے گا کہ تمام واقعی پیر اور حقیقی صوفی ایک ہی ہیں اور کسی بھی صفت میں ان میں دوگانگی نہیں پائی جاتی اور معلوم ہونا چاہئے کہ تمام مذاہب و ادیان ایک ہی ہیں اور تمام محقق عقلا کے ہاں بھی معبود و مقصود واحد ہے جو وہی حق تعالی جل جلالہ و تقدست اسماءہ ہے جو ہر لحاظ سے واحد ہے اور اس میں کسی قسم کی دوگانگی نہیں پائی جاتی. اور اگر اس کی راہ پر چل نکلنے والوں میں کسی قسم کا اختلاف بھی ہے تو جب وہ اپنے مقصد اور ہدف تک جا پہونچیں گے، یہ اختلاف ختم ہو جائیں گے اور سب وحدت میں بدل جائیں گے. اگر سالک راہ کے انسانی صفات میں سے کوئی چیز باقی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنے مقصد تک نہیں پہونچا ہے کیونکہ سالکین میں راستہ پر ہی اختلافات پیش آتے ہیں اور جب وہ مقصد اور ہدف کو پالیں گے تو اختلافات ختم ہو جائیں گے اور تمام کے تمام واحدِ مجرد ہوں جائیں گے. اور یہی وجہ ہے کہ بزرگوں میں سے کوئی یہ کہتا ہوا ملتا ہے کہ "انا الحق" اور دوسرا کہتا ہے "سبحانی" اور ہمارے شیخ کہتے ہیں "لیس فی الجبة سوی الله" (شفیعی کدکنی، ۱۳۶۶ش، ج ۱، ص ۴۸؛ مثنوی معنوی، ۱۳۶۰ش، دفتر سوم، بیت ۱۲۹۷).

دوسرا عامل جو ادیان کے درمیان بحث اور گفتگو میں مؤثر ہو سکتا ہے اور جس کا پہلے بھی ذکر آیا ہے، وہ ہے آزادی. مولانا جلال الدین کے عرفانی مسلک میں جہاں پر انسان کو بعینہ اللہ تعالی کی فکر اور اس کا مقام دیا گیا ہے، کسی کو بھی یہ حق نہیں پہونچتا کہ مختلف بہانوں اور مختلف عنوانوں سے، اس کی سوچ اور فکر کی آزادی کو محدود کر سکے؛ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ "سوچ پر کسی کی گرفت نہیں ہے اور دنیا میں آزادی ہے" کی ندا دیتے ہوئے فرماتے

ہیں: انسان خود سماجی معاہدات اور قوانین یا اپنی قوم وقبیلہ کے ناموس کے نام پر اپنے لیے قید اور حد بندیاں وضع کرتے ہیں اور ان ہی معاہدوں کی پاسبانی کو فرض شناسی کا نام دیتے ہیں اور ان کو مکمل طور پر جاری کرنے کے لئے تعصب اور سختی سے کام لیتے ہیں اور چونکہ یوں دوسروں کے وضع کیے گئے قوانین یا ان کے افکار کا احترام نہیں کر سکتے، لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ میں مصروف ہیں، حالانکہ تعصب اور سختی خامی اور خون آشامی کے علاوہ کچھ نہیں:

سخت گیری و تعصب خامی است　　تا جنینی کار خون آشامی است

(سخت گیری اور تعصب کا رویہ صرف انسان کی خامی اور جہالت کی علامت ہے، کیونکہ انسان جب تک جنین ہوتا ہے اس کا کام صرف خون چوسنا ہی ہوتا ہے.)

اسی وجہ سے عرفان میں بہتر قوموں کی جنگ کو بیہودہ بتایا گیا ہے اور اس کی نفی کی گئی ہے.

جنگ هفتاد و دو ملت همه را عذر بنه　　چون ندیدند حقیقت ره افسانه زدند

(دیوان حافظ)

(ان بہتر قوموں کی آپسی جنگ کی وجہ یہ ہے کہ، جب حقیقت ان سے پوشیدہ رہی تو سب نے افسانوی خیالات کی پیروی شروع کردی ہے.)

یوں ہر قسم کے خشک، جھوٹے اور ظاہری تعصب کو پس پشت ڈال کر؛ بنی نوع بشر سب کو ایک پیکر کے مختلف ٹکڑے سمجھتے ہیں اور اقوام کی درمیان جنگ کو بے بنیاد اور بے منطق قرار دیتے ہیں. جی ہاں! اتنی جنگیں اور دشمنیاں، سب تنگ نظری کا نتیجہ ہیں. مولانا جلال الدین کی نظر میں تمام آسمانی دین، اللہ تعالی کی توحید، موت کے بعد روح کے باقی رہنے اور قیامت میں حشر نشر اور حساب وکتاب اور معاد جیسے عقائد میں مشترک ہیں؛ اس کے باوجود تاریخ میں گذرے کچھ حالات کی وجہ سے ہمیشہ ایک دوسرے سے جنگ اور دشمنی میں مصروف ہیں؛ حال آنکہ انبیاء علیہم السلام نے بھی حقیقت کا ایک ہی رخ لوگوں پر عیاں کیا ہے اور تمام اللہ تعالی کی مدح وثنا کرتے رہے ہیں:

نام احمد نام جمله انبیا است　　چون که صد آمد نود هم پیش ماست

(مثنوی معنوی، ۱۳۶۰ش، ج۳، بیت ۱۱۰۶)

(''احمد'' کسی ایک کا نہیں بلکہ تمام انبیاء کا نام ہے، اگر ہم نے سو (۱۰۰) کو پا لیا تو گویا کہ نوے بھی ہمارے پاس ہے)

جلال الدین رومی آزادی مذہب پر اعتقاد رکھتے تھے اور تمام مذاہب کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے. اللہ تعالی قرآن کریم میں پرہیزگاروں کی تعریف میں یوں ارشاد فرما رہا ہے: ''پرہیزگار وہ لوگ ہیں جو غیب اور جو کچھ آپؐ پر اور آپؐ سے پہلے والے پیغمبروں پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں'' پھر دوسری جگہ فرما رہا ہے: ''و لا نفرق بین احد من رسله'' (بقرہ/۲۸۵)؛ لہذا ان جنگوں اور خون خرابوں کی بنیاد نفاق، جہل، حرص اور خود غرضی کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں ہوسکتی جن کو انسان کی راہ سے ہٹا دینا چاہئے. یوں عرفاء کے اخلاقیات میں عمومی صلح، انسانوں کی برابری اور ادیان کی وحدت کا بہت زیادہ کردار ہے.

پوری دنیا میرا ''وطن'' ہے اور میرا دین اور عقیدہ ''محبت'' ہے؛ چاہے کافر ہو یا مسلمان، چاہے ایشیاء ہو یا یورپ. عرفاء کی نظر میں وطن اور قوم کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے اور کلی طور پر اولیاء اور عرفاء کی نگاہ میں، وطن کا مطلب ہے ''ابدیت''، یعنی وہ جگہ جہاں پر روح، جسم خاکی سے الگ ہونے کے بعد چلی جائے گی.

ما ز بالاییم و بالا می رویم — ما ز دریاییم و دریا می رویم

ما از این جا و از آن جا نیستیم — ما ز بیجاییم و بیجا می رویم

خوانده ای انا الیه راجعون — تا بدانی که کجاها می رویم

(شمس کی غزلیات کا انتخاب، انتخاب سیروس شمیسا، ص ۱۹۸)

(ہمارا تعلق اوپر والی دنیا سے ہے اور ہم اوپر ہی جائیں گے، ہم تو سمندروں سے ہیں اور سمندروں کی طرف ہی پلٹ جائیں گے، ہمارا تعلق یہاں سے یا وہاں سے نہیں ہے، ہم تو لامکاں سے تعلق رکھتے ہیں اور لامکاں کی طرف ہی پلٹیں گے، کیا تو نے ''انا الیه راجعون'' نہیں پڑھا ہے؟ تا کہ پتا لگا سکے کہ ہم کو کہاں واپس پلٹنا ہے.)

اس نظریہ کے مطابق، عرفاء نسلی، صفتی، طبقاتی اور دینی امتیازات کو بالکل اہمیت نہیں دیتے اور خانقاہ میں شاہ و گدا، فقیر و غنی، دلیر اور ڈرپوک سب ایک دوسرے کے ہمنشیں ہوتے ہیں اور یہاں پر سطحی اختلافات اور فرق کو بڑھکانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی؛ لہذا کہنا چاہئے کہ مؤثر گفتگو کے عوامل میں سے ایک یہ ہے کہ مذہبی تعصب سے دستبردار ہونا چاہئے. مولانا جلال الدین کے عقیدہ کے مطابق، یہ دینی اختلافات اور رنگ، انسانی سماج کے بنائے ہوئے ہیں اور دوسرے الفاظ میں عالم حدوث کے احکام اور توہمات میں مبتلا تنگ نظر افراد کے بنائے ہوئے ہیں.

خدایی دنیا میں جو وحدت ہی وحدت کا مقام ہے، ان رنگوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس دنیا کا خدا نہ تو

عیسائی ہے نہ زردشتی اور نہ ہی ہندو اور بدھ مت. سے تعلق رکھتا ہے سالک اور ہر وہ شخص جو اس عالم رنگ میں زندگی کرتا ہے اور جب تک اس نے اپنے آپ کو ان چیزوں کی بندگی اور تلقینات سے رہا نہ کیا ہو، وہ مجبوراً تعصب کا شکار رہے گا اور اپنے ہم نوع انسانوں کا خون بہائے گا. ایسا دین و مذہب جو تقلیدی ہو اور جہل کی وجہ سے اس کا پابند بن گیا ہو، اس کے بجائے کہ اس کے باطن کو پاکیزہ اور اس کی پرورش کرے، اس کو برائی اور وحشیانہ اعمال کی طرف لے جائے گا، اور اس خونریزی کو اپنے لیے مباہات، فخر اور اللہ تعالی سے قربت کا باعث اور کمالات کی سیڑھی سمجھنے لگے گا؛ لیکن جب ان رنگوں سے بالاتر ہو کر سوچے گا، تو ان زنگ زدہ دلوں کو جلا بخش دے گا اور خدائی دنیا، یعنی بے رنگ دنیا کو پالے گا اور باطن کو دیکھنے والی آنکھوں سے اللہ کی مخلوقات کو دیکھے گا؛ اس وقت اختلافات اور دوگانگیوں کو نظر انداز کر دے گا اور ان سے اپنے آپ کو دور رکھے گا؛ کیونکہ خدائی دنیا میں سب وحدت ہی وحدت اور یگانگت ہے اور ایسی دنیا میں موسیٰ و فرعون کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے. مولانا جلال الدین نے اس بلند اور آزاد سوچ کو جس کا حاصل اور نتیجہ مذہب کی آزادی اور لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق دین اختیار کرنے کا حق ہے، ایسے وقت میں بیان کیا تھا جب تقریباً پورا انسانی معاشرہ مذہبی تعصب کے گرداب میں غرق ہو رہا تھا؛ ابھی صلیبی جنگیں اپنے اختتام کو نہیں پہونچی تھیں؛ اسلامی گروہ ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے اور جس گروہ کا بھی تھوڑا سا پلڑا بھاری ہوتا تھا وہ دوسرے گروہ کے مدارس کو ویران و برباد کر دیتا تھا. اہل ذمہ اور دوسرے ادیان کے پیروکاروں کو خوار اور حقیر سمجھا جاتا تھا اور جب کبھی موقع ملتا، ان کے گھروں پر دھاوا بول کر ان کو تاراج کیا جاتا اور غیر معقول اور غلط عمل کو اپنے لیے آخرت کے اجر و ثواب کا موجب سمجھتے تھے. یہ ہے مولانا جیسے شخص کی روح کی عظمت اور اس کی سوچ کی بلندی جو اپنے وقت اور حتی کہ آج کی دنیا کے بہت سے لوگوں سے درجہ ہا بلند اور عالی تھی.

ادیان کے درمیان مؤثر گفتگو کا ایک اور طریقہ، ''عشق محبت'' ہے. کیونکہ عاشق و محبت رکھنے والا شخص اپنے اوصاف سے پاک اور محبوب کی صفات میں فانی ہو جاتا ہے. اس مقام پر اپنے ارادوں اور خواہشات کی تنگی سے نجات حاصل کر کے، اپنے وجود میں، اپنے حقیقی محبوب یعنی اللہ کی شان و منزلت کی لیاقت رکھنے والی وسعت اور فراخ دلی پیدا کر سکتا ہے؛ چنانچہ ہر چیز کو اپنے اندر اور ہر چیز کو اپنے وجود ہی سے سمجھنے لگتا ہے یا اپنے محبوب کے وجود کی خوشی اور بہجت میں ایسا کھو جاتا ہے کہ قہر و لطف اس کے وجود کی خوشی و سرور کے دریا میں گم ہو جاتے ہیں. ان کے درمیان فرق ختم ہو جاتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب سالک اللہ تعالی کے کمال کے مقام پر پہنچتا ہے تو اپنے آپ کو ہر ایک چیز میں اور ہر چیز کو اپنے آپ میں محسوس کرتا ہے؛ لہذا اللہ تعالی کے تمام مظاہر سے چاہے محسوس ہوں یا معقول، محبت کرنے لگتا ہے. کیونکہ حب ذات ایک قدرتی بات اور الہی سنت ہے. دوست رکھنا اور محبت کرنا تو خود

اللہ تعالی کی ذات سے ہی شروع ہوا ہے جو بالذات عاشق اور معشوق ہے؛ لہذا کمال پر پہنچنے والا شخص، ہر ایک کو دوست رکھتا ہے؛ کیونکہ دوسروں کو اپنے آپ میں اور اپنے آپ کو دوسروں میں دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ ''کُل'' سے محبت رکھتا ہے کیونکہ وہ خود کل اور پورا جہان ہوتا ہے. یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا جلال الدین کی نظر میں واقعی درویش وہ ہوتا ہے جو نیک اور برے کو اپنے وجود کا حصہ سمجھتا ہے اور جیسا کہ انسان اپنے معذور اور بیمار اعضاء کو بھی چاہتا ہے، وہ بروں کو بھی اپنے لطف اور اپنی عنایت میں شامل کرتا ہے اور اس کی وسعت وجودی میں تمام نیک و بد شامل ہو جاتے ہیں. انبیاء بھی کلیت کی صفت سے موصوف ہوا کرتے تھے. اسی سبب سے حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ''اهـد قومی'' کیونکہ تمام آپ کے وجود مبارک کے اجزاء اور آپ کا قوام ہیں. مولانا جلال الدین فرماتے ہیں: تمام نیک اور برے لوگ ''درویش'' کے وجود کا حصہ ہیں اور جو بھی ایسا نہیں ہوگا، گویا وہ درویش ہی نہیں ہے. (فروزان فر، ۱۳۶۷ش، ص ۶۲۵ اور ۶۲۶)

بہر حال مولانا جلال الدین کی نظر میں اپنے آپ سے محبت کرنا اور اپنے آپ کو دوست رکھنے سے اتحاد اور دوستی بڑھتی ہے اور یہ ''قوموں کے اختلاف، نظریات کے اختلافات اور مذاہب کے اختلافاف صرف اس حقیقی و باطنی اتحاد پر ظاہری پردوں اور حجابوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے. وہ چیز جو ان تمام اختلافات کے باوجود، ایک چھپے ہوئے اتحاد کو لازم قرار دیتی ہے وہ ''محبت'' ہے؛ خاص طور پر ایسی محبت جو معشوق واحد، اور خانقاہ کی واحد ہستی، شیخ خانقاہ پر منتہی ہوتی ہو. مولانا جلال الدین کی نظر میں محبت جیسی بھی ہو، دو جسم، دو عاشق جانوں کے درمیان اختلاف اور جدائی ڈالنے والے فاصلوں کو ختم کر دیتی ہے'' (زرین کوب، ص ۲۸۸)

گفتگو اور عالمی صلح کا ایک اور عامل ''اصل انسانیت'' کی طرف توجہ دینا ہے. انسانوں کے مذہب اور عقیدہ کی وجہ سے اختلافات کرنے اور جدائیاں ڈالنے کا انسانی فطرت اور پیغمبروں کی دعوت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے.

انسان کی حقیقت بے رنگ ہے اور انسانیت کے افراد کے درمیان واحد اور مشترکہ بنیاد، ''اصل انسانیت'' ہے؛ تو کتنا بہتر ہوگا کہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آئیں؛ کیونکہ انسانی فطرت، کسی بھی مذہبی رنگ سے پاک ہے اور یہ دین اور عقیدے، معاشرہ کے لئے اور سماج کے امور کو نظم و ترتیب دینے کے لئے وجود میں آئے ہیں اور حدوث کا رنگ رکھتے ہیں. اہل معرفت میں سے صرف، عارف لوگ اور اولیاء ہی ہیں جنھوں نے اس عظیم حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور تمام مذاہب و ادیان کو ایک آنکھ سے ہی دیکھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک سے بھی دشمنی نہیں کرتے. مولانا جلال الدین اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

از نظر گاه است ای مغز وجود | اختلاف مؤمن و گبر و جهود
موسی و عیسیٰ کجا بد کافتاب | کشت موجودات را می داد آب
آدم و حوا کجا بود آن زمان | که خدا افکند این زه در کمان

(مثنوی معنوی، ۱۳۶۰ش، دفتر اول، بیت نمبر ۱۲۷۵ سے بعد)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

منبسط بودیم و یک جوهر همه | بی سر و بی پا بدیم آن سر همه
یک گوهر بودیم همچون آفتاب | بی گره بودیم و صافی همچو آب
چون به صورت آمد آن نور سره | شد عدد چون سایه های کنگره
کنگره ویران کنیم از منجنیق | تا رود فرق از میان این فریق

(سابقہ حوالہ، بیت نمبر ۶۸۹ سے بعد)

لہذا، اصل انسانیت میں ہم سب ایک ہی تھے اور اس سے زیادہ نہ تھے اور نہ اب ہیں. اگر اپنے آپ اور دوسروں میں جدائی کا احساس ہو رہا ہے تو یہ ہمارے اندرونی شیطان کی وجہ سے ہے جس نے ہمیں اپنے وجود کی اصل حقیقت سے دور کر دیا ہے؛ کیونکہ:

تفرقه در روح حیوانی بود | نفس واحد روح انسانی بود

(سابقہ حوالہ، دفتر دوم، بیت نمبر ۱۸۸)

عین القضاۃ ہمدانی اسی موضوع کی تشریح میں یوں فرماتے ہیں: ''اے عزیز! خدا کی راہ پر چل نکلنے والے طالب کے لئے بہت سی شرطیں ہیں جو محققین نے بہت اجمالی طور پر بیان کی ہیں. لیکن ان میں سے ایک کی تفصیل یہ ہے کہ، مشہور تہتر فرقے، سالک کے لیے ایک ہی ہیں اور ایک ہی ہونے چاہئیں اور اگر ان میں فرق سمجھے یا تفریق کرنے لگے، تو وہ شخص سالک نہیں بلکہ فارق ہوگا. حسین منصور سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ ان میں سے کون سے فرقہ کے پیروکار ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''انا علی مذهب ربی'' (میں اپنے خدا کے مذہب پر ہوں) اختلافات اور دشمنیاں، عالم خلق میں ہیں. لیکن ایزدی اور الٰہی دنیا میں عداوت اور مخالفت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور سالک جس نے اس یگانگت کی دنیا میں پاؤں رکھا ہے، تمام مذاہب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے اور کسی سے بھی دشمنی نہیں رکھتا'' (ہمدانی، ۱۳۷۳ش، ص ۵۱ فروزان فر، ۱۳۶۷ش، ج ۳، ص ۱۰۵۰ اور ۱۰۵۱، استاد فروزان فر کی شرح مثنوی

شریف سے نقل کرتے ہوئے)

عزالدین نسفی، اپنی کتاب *انسان کامل* میں یوں رقمطراز ہیں کہ ''سالک کے لیے شرط یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ صلح اور نیکی سے پیش آئے'' (انسان کامل، عزالدین نسفی، ص ۶۵). صوفیہ اور عرفاء کے مکتب کی تعلیمات میں انسان کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے اور ہر ایک فرد کو اس کے دین اور عقیدہ سے بالاتر ہو کر اس کی اصل انسانیت کو اہمیت دی جاتی ہے. مولانا جلال الدین، حضرت موسیٰ اور چرواہے اور اسی طرح ہاتھی اور ایمان یا حضرت موسیٰ و فرعون اور دوسری کئی ایک مثالیں بیان فرماتے ہوئے یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی حقیقت واحد ہے. ادیان اور عقیدوں کو اختلاف کا باعث نہیں ہونا چاہئے. ایسا دین جو نزاع اور دشمنی کا باعث بنے، فی الواقع وہ تعصّبات، غرائز اور اپنے آپ کو فوقیت دینے کی ہوئی وہوس ہے جو افراد میں دین کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے. یہ قبیلہ اور گروہوں کے رنگ، ان کی ذاتیات سے اٹھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے واحد و بسیط نور کو تجزیہ کرنے کا نتیجہ ہیں؛ حالانکہ توحیدی رنگ اور اللہ تعالیٰ کی شناخت کا رنگ، انسان کی ذات کو کدورتوں اور تعصّبات سے پاک کر دیتا ہے اور انسان کی ذات کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور صفات عالیہ کے لیے جلا بخشتا ہے. یہ عرفانی اصل بھی، عالمی صلح کے وجود میں آنے میں مؤثر اور کارگر ہو سکتی ہے جو تہذیبوں کی گفتگو کے مقاصد میں سے ہے؛ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا بھی آپس میں کوئی اختلاف نہیں تھا. وہ تمام ایک ہی چراغ کے مختلف نور تھے اور تمام انسانیت کے لیے صلح، دوستی اور اتحاد کا پیغام لے کر آئے تھے. یہ تمام اختلافات اور دشمنیاں، مخلوق کی محدود اور خود غرضانہ والی نگاہ سے ابھرتی ہیں. ''مولانا جلال الدین مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ تمام لوگ، ظاہری اختلافات کے باوجود، انگور کے دانوں کی طرح تھے. حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ''ذاتیات'' کو جو اختلاف کا موجب بن سکتی تھیں، ان سے الگ کر دیا تھا؛ اور ان کو آپس میں ایک بنا دیا تھا، ان کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا تھا ان کو گویا فرد واحد بنا دیا تھا اور ایسی صورت میں، اہل ایمان کے درمیان اختلافات اور تفرقہ کی باتیں، شیطان سے ہی منسوب کی جانی چاہئیں'' (بحر در کوزہ، زرین کوب، ص ۹۴).

عرفان کے حدود میں، مولانا جلال الدین کے بعد جس شخص نے ''اصل انسانیت'' کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، وہ شیخ ابوسعید ابوالخیر ہیں: ''آپ بہت عجیب شخصیت کے مالک، بہت قابل مطالعہ اور قابل غور ہیں؛ کیونکہ آپ میں ایک طرف تو ایرانی قوم کی خصلتیں پائی جاتی تھیں؛ کیونکہ آپ بہت نکتہ سنج، منعطف، عوامی، بلند نظر، متضاد صفتوں کے مالک، نو اندیش اور عقائد کا سختی سے احترام کرنے والے تھے اور دوسری طرف اپنے مذہب کے پابند اور اپنے سماج اور معاشرے کے حالات سے آگاہ اور ان کے ساتھ چلتے تھے۔ ساتھ ہی اپنی اندرونی تمناؤں کا

خیال رکھتے اسی طرح ارباب اقتدار کا بھی دھیان رکھتے تھے لیکن اپنی آزادی کو کبھی بھی ٹھیس نہیں پہنچنے دیتے تھے. آپ دنیاوی نعمتوں کے قائل ہوتے ہوئے بھی معنوی دسترخوانوں کی طرف بہت مائل تھے.'' (محمد علی ندوشن، ص ۱۷). ابوسعید بھی تفکر اور نظریہ کے لحاظ سے بعینہ مولانا جلال الدین کی طرح روزمرہ کی معمولی منطقی افکار سے بالاتر ہو کر چلتے تھے؛ کیونکہ مسلسل سماجی تجربوں کی وجہ سے انھوں نے اس قدر ناہمواریاں اور بے سروسامان امور دیکھے ہیں جہاں پر عام منطق اور محاسبہ جواب دے جاتے ہیں.

اطمینان سے کہا جاسکتا ہے کہ سقراط اور یونان میں ''تبادلہ خیال'' کی تحریک کے بعد اور انبیاء علیہم السلام خاص طور پر حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد، بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے ابوسعید کی طرح گفتگو اور تبادلہ خیال کی بات کو اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہوگا. آپ نے تمام قبائل اور طوائف اسی طرح مختلف ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کی ہے اور کسی قسم کے تعصب اور امتیازی سلوک کو پیش نظر رکھے بغیر، ان کو ہدایت، معرفت اور انسانیت کی راہ پر گامزن کیا ہے. *اسرار التوحید* اور جمال الدین ابوروح لطف اللہ کی لکھی ہوئی کتاب *حالات وسخنان ابوسعید*، جیسی کتابوں کی چھان بین کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے.

انسانوں کی ایک اور مشترک اصل، عقلانیت اور صاحب فکر وتعقل ہونا اور اس طرف توجہ رکھنا ہے جو مختلف ادیان کے درمیان صلح ایجاد کرنے میں بہت مؤثر ہوسکتی ہے. تعقل جو انسان کا خاصہ ہے، حکماء کی اصطلاح میں اس کو عقل نظری اور عقل عملی میں تقسیم کیا جاتا ہے: عقل نظری کا مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف پہچان اور معرفت رکھنا، عمل اور کردار کی طرف توجہ کیے بغیر؛ لیکن عقل عملی، ایسی عقل کو کہا جاتا ہے جہاں پر عمل کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے؛ یعنی کلی علوم کے علاوہ، عمل کی کیفیت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے. اگر انسان کی روح کو ایک پرندے کی طرح تصور کیا جائے، تو یہ دو طاقتیں یا یہی عقل نظری اور عقل عملی اس پرندے کے لئے دو پروں کے مانند ہوں گے جن کے بنا پرواز کرنا ممکن ہی نہیں. حضرت مولانا جلال الدین رومی جزئی عقل جو ہمیشہ مصلحتوں کی سوچوں میں پڑی رہتی ہے، اس کی مذمت کرتے ہیں؛ لیکن عقل کلی جو عرش کی دین ہے اس کی تعریف فرمائی ہے:

عاقل آن باشد که او با مشعله است — او دلیل و پیشوای قافله است

عقل باشد مرد را بال و پری — گر نباشد عقل، عقل رهبری

بی زمفتاح خرد این قرع باب — از هوی باشد نه از روی صواب

(ہمایی، ۱۳۵۴ش، ج۱، ص۴۶۱)

اور ایمانی وعرشی عقل کے بارے میں فرماتے ہیں:

عقل ایمانی چو شحنه عادل است — پاسبان و حاکم شهر دل است

عقل در تن حاکم ایمان بود — که ز بیمش نفس در زندان بود

(سابقہ حوالہ، ص۴۶۳)

اور جزوی عقل کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

عقل جزوی عقل استخراج نیست — جز پذیرای تن و محتاج نیست

عقل جزوی را وزیر خود نگیر — عقل کل را ساز ای سلطان وزیر

(سابقہ حوالہ، ص۴۶۷)

علم کلام کی کتابوں میں من جملہ عقاید نسفی میں ملتا ہے: ''**و اسباب العلم للخلق ثلاثة الحواس السليمة و الخير الصادق و العقل**'' (شرح عقائد نسفی، ص۲۳)؛ ''علم کی پیدائش کے تین اسباب ہوتے ہیں: اول سالم حواس، دوم سچی خبر، جس کا مطلب وحی ہے اور سوم عقل اور خرد ہے'' اور عقل تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہے جس کو علم و معرفت حاصل کرنے کے اوزار میں سے شمار کیا جاتا ہے؛ لہذا عقلانیت کو ادیان اور مذاہب کے درمیان بحث و گفتگو کرنے کی اصل اور بنیاد ہونا چاہئے۔

ایک اور اصل جس کی بنا پر ادیان کے درمیان گفتگو کرنے کے لئے مدد لی جاسکتی ہے، نبوت کی بحث ہے؛ البتہ گذشتہ ادیان حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے؛ حالانکہ ہم مسلمان سابقہ انبیاء اور پیغمبروں پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گذشتہ پیغمبروں کی تصدیق فرمائی ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی کی نظریہ ہے کہ تمام انبیاء نور واحد جو اصطلاحاً ''وحدت جوہر'' رکھتے ہیں لیکن ان کی تعداد اعتباری ہے اور فرماتے ہیں سب کی ایک حقیقت ہے:

چون به صورت بنگری چشم تو دوست — تو به نورش در نگر کز چشم رست

نور هر دو چشم نتوان فرق کرد — چون که در نورش نظر انداخت مرد

ده چراغ ار حاضرید در مکان — هر یکی باشد به صورت غیر آن

فرق نتوان کرد نور هر یکی — چون به نورش روی آری به شکی

(مثنوی معنوی، ۱۳۶۰ش، دفتر اول، بیت نمبر ۶۷۶ کے بعد)

پہلی بیت میں مولانا جلال الدین فرماتے ہیں: اگر آپ اپنے چہرے کو ملاحظہ کریں تو اس میں دو آنکھیں نظر آئیں گی، لیکن فی الواقع یہ دو آنکھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں؛ کیونکہ دونوں ایک ہی کام انجام دیتی ہیں اور وہ چیزوں کو دیکھنا ہے. اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان حقیقی اتحاد موجود ہے؛ لیکن ظاہری طور پر ان کے درمیان تنوع اور تعدد پایا جاتا ہے. ظاہر پرست انسان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عیسیٰ وموسیٰ علیہما السلام کے درمیان فرق سمجھتے ہیں اور اختلافات میں مبتلا ہوجاتے ہیں حالانکہ اس بات سے غافل ہیں کہ ان کی حقیقت ایک ہی ہے.

دوسری بیت میں فرماتے ہیں: یہ دیکھنے والی آنکھیں جو ظاہر میں دو ہیں، لیکن ان کا نور اور ان کی بینائی ایک ہی ہے حالانکہ دیکھنے میں یہ آنکھیں متعدد ہیں لیکن جو کچھ دکھتا ہے وہ ایک ہی ہے. اسی طرح پیغمبروں کے جسم متعدد ہیں.

تیسری بیت میں فرماتے ہیں: اگر دس چراغوں کو ایک جگہ رکھا جائے، تو ان کے تعدد کے باوجود ان کا نور واحد ہے اور ان کے نور میں کوئی فرق نہیں ہوگا؛ لہذا انبیاء کی بھی ایک ہی حقیقت ہے اور ان کی رسالت ایک ہی ہے:

این جهان یک فکرت است از عقل کل

عقل کل شـــاه است و صورت ها رسل

(سابقہ حوالہ، دوسرا دفتر، بیت نمبر ۹۷۸)

تسامح اور درگزر کرنے کا تصور اور اس کے نتیجہ میں صلح پسندی بھی ایسے موارد میں سے ہے جو ادیان و مذاہب کے درمیان گفتگو کرنے میں بہت مؤثر واقع ہوسکتی ہے. مولانا جلال الدین رومی اور ابوسعید، عرفان و معنویت کے علمبرداروں کی حیثیت سے ان خصلتوں سے بھرپور تھے.

جامی *نفحات الانس* میں یوں فرماتے ہیں: ''مولانا سراج الدین قونوی، صاحب صدر اور اپنے وقت کی بہت عظیم شخصیت تھے؛ لیکن جناب مولانا جلال الدین کے ساتھ کچھ اختلافات رکھتے تھے. آپ کو بتایا گیا کہ جناب مولانا کا کہنا ہے کہ ''میں تمام تہتر فرقوں کے ساتھ اور ان کا موافق ہوں''. کیونکہ آپ کے دل میں خلش تھی اس لیے چاہتے تھے کہ مولانا جلالدین کی دل آزاری کی جائے اور آپ کی بے عزتی ہو. اپنے قریبیوں میں سے کسی بڑے عالم کو جناب مولانا جلال الدین کے پاس بھیجا اور اس سے کہہ دیا کہ ''سب کے سامنے جلال الدین سے یہ پوچھنا کہ کیا یہ بات سچ ہے کہ آپ نے ایسی کوئی بات کہی ہے؟ اور اگر جلال الدین رومی نے اقرار کرلیا تو آپ کو گالیاں دے کر

آپ کی بے عزتی اور بے حرمتی کی جائے۔'' وہ شخص آیا اور سب کے سامنے مولانا جلال الدین سے یہی بات پوچھی کہ ''کیا آپ کا یہ کہنا ہے کہ میں تمام تہتر فرقوں کے ساتھ ہوں؟'' آپ نے فرمایا: ''جی ہاں! میں نے کہا ہے۔'' اس شخص نے گالیاں بکنا شروع کر دیں. جناب مولانا جلال الدین رومی نے تبسم فرماتے ہوئے اس شخص سے کہا: ''یہ جو تو اب کہہ رہا ہے اس کے ساتھ بھی موافق ہوں!'' وہ شخص بہت شرمسار ہوا اور واپس لوٹ گیا. (جامی، اطلاعات پبلیکیشنز، ص۴۶۲ اور ۴۶۳).

مولانا جلال الدین کا عقیدہ یہ ہے کہ شریعت، مبتدی لوگوں کے لیے ہے لیکن عارف اور مرد خدا جو کام بھی کرے گا وہ جائز ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے (کیونکہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ سب اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے اور اس کام کا فاعل حقیقی فی الواقع خود اللہ تعالی کی ذات ہے. لہذا آپ سختی کرنے کو جائز نہیں سمجھتے اور ظاہر کے بجائے باطن کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؛ ہاں البتہ شریعت کے ظواہر کی بھی مخالفت نہیں کرتے؛ کیونکہ آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ایک عارف سے توقع کی جاتی ہے ''برف کی طرح صاف اور سفید دل'' ہے جو سیر و سلوک سے حاصل ہوتا ہے؛ اسی وجہ سے فرماتے ہیں کہ: شریعت ابتدائی قدم اٹھانے کے لئے اچھی راہنما ہے؛ لیکن معرفت کے اگلے زینے طریقت اور حقیقت سے طے کیے جانے چاہیئں. آپ ایک خوبصورت مثال دیتے ہوئے شریعت کو ہرن کے قدموں اور اس کے نقش قدم سے تشبیہ کرتے ہیں حالانکہ خود حقیقت وہ ہرن ہے اور یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں ہم اس ہرن کی تلاش میں رہتے ہیں:

زاد دانشمند هست آثار قلم — زاد صوفی چیست؟ آثار قدم

همچو صیادی سوی اشکار شد — گام آهو دید و بر آثار شد

چند گاهش گام آهو در خور است — بعد از آن خود ناف آهو رهبر است

چون که شکر گام کرد و ره برید — لاجرم ز آن گام در کامی رسید

(مثنوی معنوی، ۱۳۶۰ش، دفتر دوئیم، ص۱۶)

اس فکر کے ذریعہ، اہل شریعت اور اہل طریقت کا کبھی بھی آپس میں اختلاف نہیں ہوسکتا؛ بلکہ ان کی نظر میں شریعت تو طریقت میں داخل ہونے کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے؛ اسی وجہ سے اگر اہل طریقت سے کچھ ایسے کام سرزد ہوتے ہیں جو شریعت کے مخالف ہیں تو وہ ان کو تساہل اور درگزر کرنے کی نگاہ سے دیکھتا ہے؛ جیسا کہ *مناقب العارفین* میں آیا ہے: ''اسی طرح کمال کی حدوں پر پہنچے ہوئے دوستوں سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک دن

حاسد فقہاء نے جناب مولانا رومی سے عناد ونفرت سے پوچھا کہ شراب حلال ہے یا حرام؟ حالانکہ ان کا اصلی مقصد جناب شمس الدین کی عزت کو نشانہ بنانا تھا. آپ نے کنایۃ جواب میں فرمایا: اس کا تعلق پینے والے سے ہے؛ کیونکہ اگر شراب کی ایک پوری مشک بھی دریا میں ڈال دی جائے تو دریا میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اس پانی سے وضو کرنے اور اس کو پینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن چھوٹے حوض کو شراب کی ایک بوند بھی نجس کر دیتی ہے. اسی طرح اگر نمک کے دریا میں کوئی چیز گر جائے تو وہ نمک کے حکم میں آ جاتی ہے اور اس سوال کا صریح جواب یہ ہے کہ اگر مولانا شمس الدین شراب پیتے ہیں تو ان کے لیے سب چیز مباح ہے کیونکہ وہ دریا کا رتبہ رکھتے ہیں لیکن تمہارے جیسوں کے لئے تو جو کی روٹی بھی حرام ہے. (افلاکی، ص ۶۴۰). اس طرح جناب مولانا رومی مختلف جگہوں پر تسامح اور درگزر کرنے کی سوچ کو گفتگو اور رابطہ کے لیے مہم وسیلہ سمجھتے ہیں اور تمام ادیان اور مذاہب کے ساتھ قلبی رابطہ قائم کرتے ہیں؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب آپ کی عظیم روح اعلی منازل کی طرف پرواز کر جاتی ہے، تو تمام قونیہ میں چالیس دن تک عزاداری کی جاتی ہے.

جناب افلاکی کی کتاب *مناقب العارفین* میں اس قسم کی صلح پسندی اور تسامح کے بہت افکار ملتے ہیں، یہاں نمونے کے طور پر ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے: ''نقل کیا گیا ہے کہ یار جانی، معدن معانی، بہاء الدین بحری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ ایک دن کوئی رومی معمار کسی مسجد میں بخاری کی تعمیر کر رہا تھا، دوستوں نے اس سے کہا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے کیونکہ اسلام تو سب سے بہتر دین ہے. اس نے جواباً کہا: مجھے تقریباً پچاس سال ہو چکے ہیں جو میں حضرت عیسی علیہ السلام کے دین پر ہوں، مجھے آپ سے شرم آتی ہے اور ڈرتا ہوں کہ آپ کے دین کو چھوڑ دوں. اسی وقت اچانک حضرت مولانا رومی مسجد کے دروازہ سے اندر داخل ہوئے اور فرمایا: ''یہی ڈر تو ایمان کا اصلی راز ہے. جو بھی حق تعالی سے ڈرتا ہے چاہے وہ ڈرپوک کہلائے لیکن دیندار ہوگا، بے دین نہیں ہوگا'' اور مسجد سے باہر تشریف لے گئے. اسی وقت وہ معمار ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کے حلقہ میں داخل ہو گیا اور آپ کا خالص مرید بن گیا'' (افلاکی، بہ کوشش تحسین یازیجی، ص ۴۷۶ اور ۴۷۷) بہر حال دینداری کے بارے میں جناب مولانا رومی کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کی اصل اور اس کا مغز حاصل کیا جائے جس کے نتیجہ میں صلح و دوستی حاصل ہوگی اور اس عمارت کو آباد کرنے کے لئے تسامح برتنا ہوگا؛ کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر ادیان کے درمیان جنگ کے بجائے ان میں صلح نظر آئے گی. لہٰذا فرماتے ہیں:

چو فرمودست حق کالصلح خیر　　رها کن ماجرا را ای یگانه

(افلاکی، ص ۴۶۵)

شیخ ابوسعید بھی تسامح اور درگزر کرنے والے عرفاء میں سے ہیں. آپ کے بارے میں *اسرار التوحید* میں یوں ملتا ہے: ''جب شیخ نیشابور میں مقیم تھے، ایک دن قبرستان حیرہ میں تشریف لے گئے وہاں پر مشائخ کی قبروں پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ وہاں پر شراب پی رہے ہیں اور ساتھ ساتھ کچھ بجا بھی رہے ہیں. ساتھ آنے والے صوفی حضرات کو غصہ آیا اور چاہا کہ ان لوگوں کی پٹائی کر دیں، لیکن شیخ نے اجازت نہیں دی. جب شیخ ان لوگوں کے قریب پہنچے تو فرمایا: ''اللہ تعالی نے جس طرح آپ کو اس دنیا میں خوش رکھا ہے، دوسری دنیا میں بھی خوش رکھے''. وہ لوگ سب کے سب اٹھے اور آپ کی سواری کے پاؤں میں آ گرے اور شراب پھینک دی اور اپنے ساز و آواز کے سامان کو توڑ ڈالا اور توبہ کر لی اور شیخ قدس اللہ روحہ العزیز کی نظر مبارک کی برکت سے وہ تمام لوگ نیک بندوں میں سے ہو گئے''. (اسرار التوحید، تصحیح محمد رضا شفیع کدکنی، ج ا، ص ۲۳۷).

ابوسعید نے اپنے اسی تسامح کے نظریہ کے ساتھ بہت سارے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، وہ بھی ایسے لوگ جو کسی قیمت پر بھی اپنا مذہب چھوڑنے کو تیار نہ تھے. ''جیسا کہ ہم ابومحمد جوینی اور آپ کے یہودی وکیل کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ آپ نے کئی سالوں سے اپنے وکیل کو مسلمان ہونے کی دعوت دی ہوئی تھی اور حتی کہ مسلمان ہونے کی صورت میں اپنے پورے مال کا آدھا حصہ اس کو دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے لیکن وہ کہتا تھا کہ: ''میں دینا کے لئے اپنے دین کو نہیں چھوڑوں گا'' (اسرار التوحید، تصحیح محمد رضا شفیع کدکنی، ص ۸۳، ۸۴) لیکن آخر میں ابوسعید کی ملاقات میں آپ کی باتیں سن کر آپ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لیا.

ابوسعید کی نظر میں اسلام لانے کا ظاہری شان و شوکت اور ایسی تبلیغات سے کوئی تعلق نہیں تھا جن پر وقت کے علماء فخر کرتے تھے اور ہمیشہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی نہ کوئی غیر مسلمان ان کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لے. ابوسعید کی نظر میں اسلام، ''لا اله الا الله'' کو زبان پر جاری کرنے کی ظاہر داری کا نام نہیں تھا؛ بلکہ آپ کی نظر میں اسلام قبول کرنے کا بہت گہرا اور معاشرتی مفہوم تھا. آپ کی نظر میں اسلام، خلوص اور اپنی تمام چاہتوں سے عبور کرنے کا نام ہے. خاص طور پر مادی چاہتوں سے گزر جانا جو عام طور پر لوگوں کے لئے بہت مشکل کام ہوتا ہے اور جب ایک یہودی نے آپ کے پاس آ کر مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے اس کو روکا اور فرمایا کہ تمہارے لیے مسلمان بننا ضروری نہیں ہے. لوگوں نے اعتراض کیا کہ شیخ ایک یہودی کو مسلمان ہونے سے روک رہے ہیں. جب اس شخص اور دوسرے لوگوں کے اصرار کو دیکھا تو اس شخص سے پوچھا: ''کیا تو اپنی جان اور اپنے مال سے بیزار اور بری ہو چکا ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''جی ہاں!'' آپ نے فرمایا: ''میری نظر میں بس یہی اسلام ہے، اب اس شخص کو ابوحامد اسفرائنی کے پاس لے جاؤ تا کہ اس شخص کو ''منافقوں کی لوری'' سکھا دیں اور منافقوں کی لوری

سے آپ کا مقصد وہی "لا اله الا الله" تھا.(اسرار التوحید، تصحیح محمد رضا شفیع کدکنی، ص ۲۱۹)

مولانا جلال الدین اور ابوسعید کے افکار کے بارے میں بہت گفتگو ہو سکتی ہے. ہم نے بہت مختصر طور پر ان کے افکار کی طرف اشارہ کیا ہے. امید ہے آئندہ مزید تحقیق اور غور و فکر سے عرفان کے ان دو علمبرداروں کے معنوی دریا سے زیادہ مطالب قارئین کی نذر کریں گے.

منابع اور مآخذ

۱.قرآن کریم

۲.ابن عبدربہ، عقد الفرید، ج ۱.

۳.اسرار التوحید، تصحیح محمد رضا شفیع کدکنی، آگاہ پبلیکیشنز، ۱۳۷۶ش، ج ۱.

۴.اسلامی ندوشن، محمد علی، ماجرای پایان ناپذیر.

۵.افلاکی، احمد، مناقب العارفین، بہ کوشش تحسین یازیجی، دنیای کتاب پبلیکیشنز، تہران، ۱۳۶۲ش.

۶.بلخی، مولانا جلال الدین، مثنوی معنوی، تصحیح نیکلسن، مولا پبلیکیشنز، تہران، ۱۳۶۰.

۷.جامی، نفحات الانس، اطلاعات پبلیکیشنز.

۸.زرین کوب، عبدالحسین، بحر در کوزہ، علمی پبلیکیشنز.

۹.زرین کوب، عبدالحسین، پلہ پلہ تا ملاقات خدا، علمی پبلیکیشنز.

۱۰.طبری، جریر، تاریخ طبری، مصر، ج ۵.

۱۱.فروزان فر، شرح مثنوی شریف، چاپ زوار، ۱۳۶۷ش، ج ۲، ۳.

۱۲.گزیدہ غزلیات شمس، بہ انتخاب سیروس شمسیا.

۱۳.مجلّہ تبیان: مرکز بزرگ اسلامی غرب کشور، بہ قلم کریمی نیا، محمد مہدی.

۱۴.نسفی، عزالدین، انسان کامل.

۱۵.وسائل الشیعہ، کتاب جہاد.

۱۶.ہمایی، جلال الدین، مولوی نامہ، آگاہ پبلیکیشنز، تہران، ۱۳۵۴ش، ج ۱.

۱۷.ہمدانی، عین القضات، تمہیدات، منوچہری پبلیکیشنز، ۱۳۷۳.

نہج البلاغہ میں شیعہ سنی اتحاد

سعید خو محمدی خیر آبادی
ترجمہ: محمد باقر رضا

آغاز سخن

اتحاد ایسا لفظ ہے جو مدتوں پہلے اسلامی ممالک کے دینی ماحول میں آچکا ہے، اور رفتہ رفتہ اس نے ایک خاص جگہ بنالی ہے۔ شیعہ سنی علماء اور روشن فکروں نے استعمار کی مختلف سازشوں کو دیکھ کر، اسلامی حکومت اور امت کے درمیان ان کے اختلاف اور انتشار پھیلانے کو دیکھ کر ہر زمانے سے زیادہ اس سلسلہ میں اپنی کوششیں تیز کردی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی نہ ہی تفرقہ کے مختلف پہلوؤں کو اسلام و مسلمانوں کے لئے خطرات کی حیثیت سے مکمل طور پر دیکھا گیا ہے، اور نہ ہی ان خطرات سے بچاؤ کے طور پر اتحاد کے مفہوم کی تہوں میں اترا گیا ہے۔ اس مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجمالی طور پر شیعہ سنی اتحاد کو نہج البلاغہ کے تناظر میں دیکھا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے بابرکت زمانے میں اسلام کی ایک ہی تفسیر کی جاتی تھی، جو قرآن اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے عبارت تھی۔ لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کی رحلت ہوتے ہی مسلمانوں کے ایمان کو لیکر دو زاویہ نظر کے گروہ وجود میں آئے: پہلا گروہ ان اصحاب کا تھا جو سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوا تھا اور اپنے دلائل کے تحت انھوں نے خلافت کو ایسا امر سمجھا کہ جس کے بارے میں دین کے اندر پہلے سے

کوئی بات سوچی نہیں گئی تھی اس لئے ان کی نظر میں خلیفہ کا انتخاب لوگوں کی رائے سے وابستہ تھا۔ دوسرا گروہ ان اصحاب کا تھا جنھوں نے اپنی دلیلوں کی بنیاد پر خلافت کی الگ تفسیر کی اور امامت کو نبوت کا دوام سمجھا۔ اور حضرت علی علیہ السلام کو وہ شخص جانا اور مانا جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے غدیر خم میں تصریح کے ساتھ اپنی جانشینی اور خلافت کے لئے منصوب فرمایا تھا۔ البتہ دین کی ان الگ الگ تفسیروں کے باوجود حتی اصل واساس امامت میں فی نفسہ اختلاف ہونے کے باوجود یہ اختلافات، مسلمانوں کے درمیان جدائی اور دوری کا سبب نہیں ہونا چاہئیں۔

صدر اسلام اور خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں حضرت علی علیہ السلام کا کردار مذکورہ دعوی پر بہترین دلیل ہے۔ کہ آپ نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا خلیفہ برحق سمجھنے کے باوجود اور ایک اعتقادی نظریہ کے طور پر اس کو مختلف مقامات پر بیان کرنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ خلفاء کے مقابل کھڑے نہ ہوئے بلکہ اس حد تک آگے گئے، مختلف مواقع پر خلفاء کو مشورہ دیا، اپنے پیروکاروں کو ان کے تعاون کی ترغیب دی، دیوانی اور قضاوت جیسے کاموں حتی جنگ کے امور میں شرکت کی، خلیفہ سوم سے ناراض لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور ان کو قتل خلیفہ سے روکتے رہے، یہاں تک کہ حسنین علیہما السلام کو دار الخلافت کی نگہبانی پر مامور کیا۔ یہ سب باتیں اس اہم اور فیصلہ کن نکتہ کو بیان کرتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امامت و قیادت پر پیش آنے والا اختلاف، امت کے درمیان تفرقہ کا پیش خیمہ بن جائے۔ دیگر ائمہ علیہم السلام کی سیرت بھی اس سے ہٹ کر نہیں رہی ہے۔ یہ بزرگ شخصیتیں ایک طرف اپنے عقائد و نظریات کو بیان کرتی تھیں، انھیں اپنی پر برکت زندگی میں اپنے شاگردوں کو سکھاتی تھیں، دیگر مسلمانوں سے بنیادی طور پر الگ نظریات رکھتی تھیں، تو دوسری طرف ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ یہ اختلاف نظر مسلمانوں کے درمیان تفرقہ وانتشار کا سبب نہ بننے پائے۔ ہمیں کسی طرح ان کی زندگی میں لعن وطعن اور دشنامی و بدکلامی کی زبان سننے کو نہیں ملتی۔ تاریخ کے باخبر، روشن ضمیر اور اتحاد کے اوپر یقین رکھنے والے علماء نے بھی ہمیشہ اسی سیرت کو اپنایا ہے۔ اس کے باوصف تلخ حقیقت یہ ہے کہ ان سب سعی و

کوشش کے باوجود شیعہ سنی کے درمیان خصوصا آخری چند صدیوں میں عوام کے درمیان بھی اور علماء کے درمیان بھی اختلاف کا دور دورہ رہا ہے اور حکام وقت نے اس کا بھرپور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہے اور تفرقہ واختلاف کی آگ کو ہوا دی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کے اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی فرقے اپنی بنیادوں کی حفاظت کرتے ہوئے ایک دوسرے سے قریب ہوں۔

یعنی مشترک اصولوں کی حفاظت کرنا اور ہر فرقہ کو اپنی خاص فروعات میں معذور سمجھتے ہوئے صاحب اختیار قرار دینا۔

یعنی باہمی فرقہ وارانہ اختلافات سے پرہیز اور تمام فرقوں کا ایک دوسرے کے عقائد سے آگاہ ہونا اور دوسرے فرقہ کے خاص عقائد وتشخصات کے بارے میں غیر جانبدار رہنا اور اس سلسلہ میں حساس نہ ہونا۔

اس ہدف تک پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ عقل اور منطق پر تکیہ کرتے ہوئے وقتی جذبات اور بے جا تعصّبات سے پرہیز کیا جائے۔

اس موضوع کو لے کر جب ہم نہج البلاغہ کھولتے ہیں تو حضرت علی علیہ السلام کے اس قول پر نظر پڑتی ہے "**لأنه اسم سلامة و جماع كرامة**" اسلام، سلامتی کا نام اور کرامتوں کا مرکز ہے۔ (نہج البلاغہ، خ ۱۵۲)

اسلام، سلامتی سے بنا ہے؛ اسلام کی روح اور اس کی حقیقت میں سلامتی رچی بسی ہوئی ہے اور تمام انسانی کرامتیں اس میں جمع ہوگئی ہیں، لہذا جو لوگ اسلام کے پرچم تلے جمع ہوئے ہیں ان کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ سلامتی اور یکجہتی کے ساتھ رہنا چاہئے اور اپنی ذاتی شرافت، کرامت وحرمت کو ہمیشہ زندہ و بیدار رکھنا چاہئے۔

جو لوگ اپنے بنیادی عقیدوں کے طور پر اللہ، دین، رسول، قبلہ اور کتاب میں مشترک ہوں اور اللہ نے بھی چودہ سو سالوں تک دشمنوں کی سازشوں سے ان کے بنیادی عقائد کو محفوظ رکھا ہو، انھیں چاہیے کہ ہمیشہ اپنے بنیادی اصول وعقائد کو مدنظر رکھیں اور انھیں اپنے لازوال اتحاد، یکجہتی اور یکسوئی کا سبب سمجھیں۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ اس قرآن کو اپنے سامنے رکھیں جس کے لاکھوں خطی اور چاپی نسخے موجود ہیں اور جس کے بارے میں ہر ایک کو اعتراف ہے کہ یہی اصل اور صحیح نسخہ ہے، ہر گھر میں جس کا کم از کم ایک نسخہ موجود ہے اسے اپنے سامنے رکھیں اور آیۂ ﴿ **واعتصموا بحبل الله جميعا** ﴾ (آل عمران/۱۰۳) پر اپنی نگاہیں مرکوز کریں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ یہ آیت خود ان کے عقیدے کے مطابق اپنے تمام تر الفاظ وحروف کے ساتھ وحی

الٰہی ہے اس آیت میں اللہ نے ان کو عزت وسعادت اور کمال وسلامتی کی راہ دکھائی ہے۔ایک صفحہ اور کھولیں اور آیۂ ﴿ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم ﴾ (انفال/۴۶) کو دیکھیں اور ایک بار پھر یاد کریں کہ یہ آیت بھی اپنے تمام الفاظ وحروف کے ساتھ سب کے لئے تصدیق شدہ ہے۔مزید ایک صفحہ کھولیں اور آیۂ "انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم "(حجرات/۹) پر نظر ڈالیں ایک اور صفحہ پر آیۂ ﴿ ان هذه امتكم امة واحدة ﴾ (انبیاء/۹۲،مومنون/۵۳) پر غور کریں۔ بلکہ جس صفحہ کو بھی کھولیں گے اور جس سورے کو بھی پڑھیں گے ایسی آیت مل جائے گی جو صراحتاً یا اشارتاً ان سے کہہ رہی ہوگی کہ اتحاد واتفاق، کامیابی وسربلندی کا اور اختلاف انتشار، ناکامی وسرنگونی کا پیش خیمہ ہے۔

حسن اتفاق سے قرآن کے علاوہ سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ، روایات اہلبیت علیہم السلام جو کہ کم و بیش تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہیں، یہ سب اسی عزت وسربلندی اور سعادت وخوش بختی کے نسخے کو بیان کرتی ہیں۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

۱۔ دوستی، مہربانی اور محبت کے اعتبار سے مومنین آپس میں ایک انسان کے پیکر کی مانند ہیں، اگر کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو دوسرا عضو بھی بخار کی سوزش اور شب بیداری سے متاثر ہوتا ہے (مثل المؤمنين في توادهم و تراحمهم و تعاطفهم كمثل الجسد الواحد، اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر و الحمى) ،(صحیح بخاری، ادب، ۳۷؛ صحیح مسلم ص/۶۶، مسند احمد ابن حنبل، ج/۴، ص/۲۷۰)

بنی آدم اعضائی یک دیگرند — کہ در آفرینش زیک گوہر ند
چو عضوی به درد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

(البتہ سعدی کی تحریف یہ ہے کہ انھوں نے 'مومنین' کو 'بنی آدم' سے بدل دیا ہے۔ بنی آدم تمام انسانوں کو شامل ہوجاتا ہے، جبکہ انسانوں میں ایسے گروہ بھی ہیں جو مثلاً انسان دشمن اور نژاد پرست ہیں اور ان کو ایک پیکر کے اعضاء نہیں کہا جاسکتا، صرف اہل ایمان ہیں جو اپنے عقیدہ کی بنیاد پر تمام اہل ایمان کو بھائی سمجھتے ہیں۔)

۲۔ جو مسلمانوں کے امور کی فکر نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔(اصول کافی ج۲، ص۱۶۳)

۳۔ جو شخص ایک بالشت برابر (مسلمانوں کی) جماعت سے دور ہوجائے (اور اسی حال میں مرجائے) اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔(من فارق الجماعة شبرا فميتته جاهلية) (بخاری، باب فتن، ص/۲

،مسلم باب امارہ،ص/۵۳)۔

۴۔آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کیا تمھیں ایسا عمل بتاؤں جس کا درجہ نماز، روزہ اور صدقہ سے زیادہ ہے اصحاب نے کہا: ہاں! فرمایا: لوگوں کے درمیان صلح مصالحت کرانا، اور لوگوں کے درمیان لڑائی جھگڑا کرانا ہلاکت کا سبب ہے۔(**قال رسول الله –صلى الله عليه و آله–الا اخبركم بافضل من درجة الصلاة و الصيام و الصدقه؟ قالوا : بلى؛ قال اصلاح ذات البين و فساد ذات البين هى الحالفة**) (بخاری، ج/۱،ص/۱۱؛سنن ابی داؤد،ص/۵۰؛موطا مالک،ص/۷؛مسند احمد، ج/۶،ص/۴۴۵)

قرآن وسنت کے علاوہ بھی اسلام کے تمام کے تمام دستورات چاہے مستحبات ہوں یا واجبات سب کا آخری نتیجہ مسلمانوں کے درمیان الفت ومحبت اور برادری و برابری کی ترویج ہے،مثلاً نماز جمعہ و جماعت،سلام کرنا، مصافحہ،معانقہ، پیشانی چومنا،تبسم،مومن کوخوش کرنا،مشورہ،نصیحت،تعاون، باہمی مسائل میں صلح ومصالحت،صفائی، امانت، عدالت،سچائی، دلاسا،مہربانی، الفت، والدین کے ساتھ احسان،صلہ رحمی، پڑوسی اور ساتھی کے حقوق کی رعایت،یتیموں کا خیال،میزبانی،مومنین کی ضرورتوں کو پورا کرنا،حسن سلوک،مزاح وخوش طبعی،مسافر کا استقبال و وداع، ہدیہ وتحفہ،مریض کی عیادت، تشییع جنازہ،مصیبت پرتعزیت،تواضع،غصہ کو پینا، زکات، انفاق،مومنین کے لئے دعا کرنا اور نیکی کرنے والے کا شکریہ ادا کرنا۔

مجموعی اعتبار سے جس کام سے بھی حرمت یا کراہت کے طور پر نہی کی گئی ہے،مسلمانوں کے درمیان اختلاف وانتشار کو روکنے کے لئے ہے۔مثلاً بدگمانی،تجسّس،جھوٹ،غیبت، برا بھلا کہنا،تکبّر،خودخواہی،ڈکٹیٹرشپ اور خودسری، مذاق اڑانا، ملامت،چڑھ نکالنا، ڈانٹنا،تحقیر،توہین،شماتت (دوسروں کی مصیبت پرخوش ہونا،خندہ زنی، طعنہ زنی)،قطع رحم،عقوق والدین،چغلی، دھوکہ دھڑی، ملاوٹ،کم فروشی، احتکار، لالچ، ریاکاری،ظلم وستم،منافقت، کینہ توزی،سختی،غلط بات پراَڑنا، دوسروں کے سامنے سرگوشی، وعدہ خلافی، بیجا تعصب اور الزام تراشی۔

حسن اتفاق سے یہ تمام موارد شیعوں کی کتب اربعہ اور اہلسنت کی صحاح ستہ میں موجود ہیں اور تمام مؤلفین نے ان کو انھیں الفاظ یا مترادف الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہر عنوان کے ذیل میں قرآنی آیت یا حدیث اور نہج البلاغہ کی یا کسی اور کتاب کی روایت کو بیان کیا ہے۔

ہم یہاں پرصرف نہج البلاغہ سے اسلامی اتحاد کی اہمیت اور اختلاف وتفرقہ کے نقصان کے سلسلہ میں امیرالمؤنین علیہ السلام کی کچھ سفارشات کو ذکر کریں گے اور ان کو گیارہ حصوں میں بیان کریں گے:

۱۔حضرت علی علیہ السلام،بکھرے ہوئے لوگوں کے درمیان الفت ومحبت قائم کرنے کو خاتم النبیین صلی

اللہ علیہ وآلہ کی نبوت کا سب سے بڑا کارنامہ بتاتے ہیں۔ وہ لوگ جو بیجا تعصب کی بنا پر آپس میں دست وگریباں تھے اور ضلالت وپستی میں گرنے ہی والے تھے؛ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے اسلام کی حیات بخش تعلیم کے ذریعہ ان کو خدائے واحد کی طرف متوجہ کیا اور انھیں محفلوں واجتماعوں میں ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ وہمی امتیازات کو ختم کیا اور سیاہ وسفید، عرب وعجم، فقیر وغنی اور اونچے ونچلے طبقے کے لوگوں کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیا اور فضیلت وامتیاز کو تقوی، علم اور جہاد میں رکھا جو کہ محنت وکوشش کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، مال وثروت، حسب ونسب اور رنگ و نژاد میں نہیں رکھا جو کہ اتفاق یا قسمت سے ملتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اللہ کی ان عظیم نعمتوں کی قدر سمجھو جن نعمتوں کے بارے میں قرآن فرماتا ہے ''اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو: تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دلوں میں محبت ڈال دی، اور اللہ کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے، تم آگ کے الاؤ میں گرنے ہی والے تھے کہ اللہ نے تمھیں نجات دی'' (آل عمران/۱۰۳)۔ ان نعمتوں کی قدر سمجھو اور اتحاد واتفاق کے بعد پھر سے اختلاف و انتشار کا شکار نہ ہونا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

الف: نیک لوگوں کے دل ان پر شیفتہ ہوگئے، آنکھوں کے زاویہ ان کی طرف اٹھ گئے، ان کے وجود کی برکت سے اللہ نے پرانے کینوں کو دفن کر دیا، دشمنی کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور لوگوں کے درمیان الفت ومحبت پیدا کی اور بھائی چارگی قائم کی۔ (**قد صرفت نحوه افئدة الابرار ...**) (نہج البلاغہ، خ/۹۶)

ب: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے اللہ کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے قیام کیا، اللہ کے پیغام کو پہنچایا، اللہ نے آپ کے ذریعہ زخموں کو مندمل کیا، فاصلوں کو ختم کیا، رشتہ داروں میں الفت پیدا کی، جبکہ اس سے پہلے سینوں میں دشمنی کی آگ اور دلوں میں بھڑکتے کینے پرورش پا رہے تھے۔ (**فصدع بما امر به و بلّغ رسالات ربّه ...**) (نہج البلاغہ، خ/۲۳۱)

ج: اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کو بھیجا تا کہ اپنے وعدہ کو پورا کر سکے اور ختم نبوت کر سکے، وہ تمام انبیاء سے ان کی نبوت کا اقرار لے چکا تھا، ان کی نبوت کی نشانیاں واضح اور ان کی ولادت مبارک تھی۔ اس وقت زمین پر لوگ مختلف مذہبوں کے پیروکار تھے، پراکندہ خواہشیں تھیں، بکھرے ہوئے گروہ تھے: کچھ لوگ اللہ کو مخلوقات سے تشبیہ دیتے تھے، کچھ لوگ ملحد تھے، بعض کے معبود، خدائے یگانہ کے علاوہ کچھ دوسرے تھے؛ لیکن اللہ نے ان کے وجود کی برکت سے لوگوں کو گمراہی سے بچایا اور جہالت سے نجات دی۔ (**الی ان بعث الله سبحانه محمدا**

رسول الله (ص) لانجاز عدته ...) نہج البلاغہ، خ/۲۱۶)

۲۔ امت اسلامی کے اتحاد کی اتنی اہمیت ہے کہ اللہ نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد بھی لوگوں کو بغیر سرپرست کے نہیں چھوڑا تا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے ایثار وفداکاری کے نتیجہ میں جو اتحاد واتفاق کا ماحول بنا تھا اور تاریخ کے بہترین مؤمن وذمہ دار انسان سامنے آئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد اس ماحول کو امت کے سفہاء خراب نہ کرڈالیں اور پرانی جاہلیت کی طرف نہ پلٹ جائیں۔

اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد لوگوں کے لئے ایک حاکم بنایا۔ حضرت علی علیہ السلام نے شریعت سے قطع نظر ہر حال میں ایک حاکم کے ضروری ہونے کے بارے میں فرمایا ہے:" **لابدّ للناس من امیر برّ او فاجر** " (نہج البلاغہ، خ/۴۰) (لوگوں کے لئے ایک حاکم ہونا ضروری ہے چاہے وہ اچھا ہو یا برا)۔ اور آپ نے الٰہی حاکم کے وجود کے فلسفہ کو اتحاد اتفاق اور دین کی عزت وشان قرار دیا اور فرمایا ہے:

''اللہ نے جو حقوق اپنے بندوں کے درمیان قرار دئے ہیں ان کے درمیان عظیم حقوق میں وہ حق ہے جو حاکم کا رعایا پر اور رعایا کا حاکم پر ہوتا ہے؛ وہ حقوق جنھیں اللہ نے حاکم ورعایا پر رکھا ہے اور ان کو محبت اور دین کی شان کا سبب قرار دیا ہے'' (**و اعظم ما افترض سبحانه من تلک الحقوق حق الوالی علی الرعیة ...**)(نہج البلاغہ، خ/۲۱۶)

۳۔ حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں گذشتہ امتوں کی عزت وسربلندی کی سب سے بڑی وجہ ان کا اتحاد اتفاق تھا اور ان کی ذلت وناکامی کا سب سے بڑا سبب ان کا اختلاف وانتشار تھا۔ آپ فرماتے ہیں:

''برے اعمال کے سبب گزشتہ امتوں پر نازل ہونے والے عذاب سے خبردار رہو، اچھے برے حالات میں ان کو یاد رکھو اور ان کی طرح ہونے سے بچو''

ان کے اچھے برے حال پر غور کرنے کے بعد ان کے ان کاموں کو اپناؤ جن کے سبب وہ صاحب عزت ہوئے، دشمن ان سے دور رہے، عافیت ان کی طرف کھنچی چلی آئی، ان کے سامنے نعمتیں بچھ گئیں اور کرامت وشرافت کے رشتے ان سے جڑ گئے۔

ان کی عزت وبزرگی کے اسباب یہ تھے کہ: انھوں نے تفرقہ سے دوری اختیار کی، محبت سے کام لیا، اس کی دعوت دیتے رہے اور اسی کی سفارش کرتے رہے،۔ ہر اس کام سے پرہیز کرو جس نے ان کی کمر توڑ دی ان کی طاقت کو ہلکا کردیا منجملہ دلوں کا کینہ، سینوں کی تنگی، ایک دوسرے سے منہ پھیرنا، ایک دوسرے کا ہاتھ نہ بٹانا۔

دیکھو وہ کیسے باعزت رہے جب تک وہ ایک جگہ اکٹھا رہے، ان کے مقصد ایک رہے، ان کے دل

معتدل رہے، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہے، تلواروں سے ایک دوسرے کا دفاع کرتے رہے، بصیرتیں نافذ رہیں اور عزم وارادے میں یکسوئی رہی۔ کیا وہ ان حالات میں زمین کے چپہ چپہ کے فرمانروا اور دنیا والوں کی شہ رگوں کے مالک نہیں رہے؟

لیکن پھر آخر کار ان کا انجام کیا ہوا جب ان کے درمیان افتراق پیدا ہو گیا اور محبتوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ باتوں اور دلوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور سب مختلف جماعتوں اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو گئے، تو پروردگار نے ان کے جسم سے کرامت کا لباس اتار لیا اور ان سے نعمتوں کی شادابی کو سلب کر لیا اور اب انکے قصے صرف عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے سامان عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔

لہٰذا اب تم اولاد اسماعیل علیہ السلام اور اولاد اسحاق و اسرائیل (یعقوب) سے عبرت حاصل کرو کہ سب کے حالات کس قدر ملتے ہوئے اور کیفیات کس قدر یکساں ہیں۔ دیکھو انکے انتشار و افتراق کے دور میں ان کا کیا عالم تھا کہ قیصر و کسریٰ ان کے ارباب بن گئے تھے۔ اور انھیں اطراف عالم کے سبزہ زاروں، عراق کے دریاؤں اور شادابیوں سے نکال کر خاردار جھاڑیوں اور آندھیوں کی بے روک گزرگاہوں اور معیشت کی دشوار گزار منزلوں تک پہنچا کر اس عالم میں چھوڑ دیا تھا کہ وہ فقیر و نادار، اونٹوں کی پشت پر چلنے والے اور بالوں کے خیموں میں قیام کرنے والے ہو گئے تھے گھر بار کے اعتبار سے تمام قوموں سے زیادہ ذلیل اور جگہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ خشک سالیوں کا شکار تھے نہ ان کی آواز تھی جس کی پناہ لے کر اپنا تحفظ کر سکیں اور نہ کوئی الفت کا سایہ تھا جس پر بھروسہ کر سکیں۔ حالات مضطرب، طاقتیں منتشر، کثرت میں انتشار، بلائیں سخت، جہالت تہ بہ تہ، زندہ درگور بیٹیاں، پتھر پرستش کے قابل، رشتہ داریاں ٹوٹی ہوئیں اور چاروں طرف سے یلغار۔

اس کے بعد دیکھو کہ پروردگار نے ان پر کس قدر احسانات کئے جب ان کی طرف ایک رسول بھیج دیا جس نے اپنے نظام سے ان کی اطاعت کو پابند بنا لیا اور اپنی دعوت پر ان کی الفتوں کو متحد کر دیا اور اس کی نتیجہ میں نعمتوں نے ان پر کرامت کے بال و پر پھیلا دئے اور راحتوں کے دریا بہا دئے شریعت نے انھیں اپنی برکتوں کے بیش قیمت فوائد میں لپیٹ لیا۔ وہ نعمتوں میں غرق ہو گئے اور زندگی کی شادابیوں سے مزے اڑانے لگے، ایک مضبوط عالم کے زیر سایہ حالات سازگار ہو گئے اور حالات نے غلبہ و بزرگی کے پہلو میں جگہ دلوائی اور ایک مستحکم ملک کی بلندیوں پر دنیا و دین کی سعادتیں ان کی طرف جھک پڑیں۔ وہ عالمین کے حکام ہو گئے اور اطراف زمین کے بادشاہ شمار ہونے لگے جو کل ان کے امور کے مالک تھے آج یہ ان کے امور کے مالک ہو گئے اور اپنے احکام ان پر نافذ کرنے لگے جو کل اپنے احکام ان پر نافذ کر رہے تھے کہ اب ان کا دم خم نکالا جا سکتا تھا اور نہ ان کا زور ہی توڑا

جاسکتا تھا۔

دیکھو تم نے اپنے ہاتھوں کو اطاعت کے بندھنوں سے جھاڑ لیا ہے اور اللہ کی طرف اپنے گرد کھنچے ہوئے حصار میں جاہلیت کے احکام کی بنا پر رخنہ پیدا کر دیا ہے۔ اللہ نے اس امت کے اجتماع پر یہ احسان کیا ہے کہ انھیں الفت کے ایسے بندھن میں باندھ دیا ہے کہ اس کے زیر سایہ سفر کرتے ہیں اور اسی کے پہلو میں پناہ لیتے ہیں اور یہ وہ نعمت ہے جس کی قدر و قیمت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا اس لئے کہ یہ ہر قیمت سے بڑی قیمت اور ہر شرف و کرامت سے بڑی کرامت ہے۔ (نہج البلاغہ، خ/۱۹۲)

جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: ''اللہ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کی اور اگر آپ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ ہوتی لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کی بیشک وہ غالب اور رحم کرنے والا ہے۔ (انفال/۶۳)

۴۔ اللہ ان لوگوں کو کسی طرح کی خیر و سعادت عطا نہیں کرتا جو اختلاف و انتشار کا شکار ہیں۔ نہ اس سے پہلے کبھی عطا کی ہے نہ اب عطا کر سکتا ہے اور نہ کبھی عطا کرے گا۔

حضرت علی علیہ السلام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: اللہ نے گزشتگان اور ان کے پسماندگان میں سے کسی کو اختلاف و تفرقہ کی بنیاد پر کوئی خیر عطا نہیں فرمایا۔ (**ان اللہ سبحانہ لم یعط احدا بفرقة خیراً ممن مضی، ولا ممن بقی**) (نہج البلاغہ، خ/۱۷۶)

جن لوگوں نے وہمی بنیادوں پر اپنے ہم مذہبوں اور اپنے بھائیوں سے منھ پھیر لیا ہے، انھوں نے گویا زندگی کی خوشیوں اور محبتوں کو نفرتوں اور دشمنیوں میں بدل دیا ہے اور اپنی خام خیالی میں سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کو کوئی فائدہ مل جائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام بڑے کھلے الفاظ میں ایسے لوگوں سے فرماتے ہیں کہ آپ کی سوچ غلط ہے اور آپ کی راہ کسی طرح منزل تک نہیں پہنچائے گی، آپ آخر کار ایسے نتیجہ تک پہنچیں گے جو آپ کا مقصود نہیں ہوگا بلکہ آپ کے مقصود کے برعکس ہے۔ بیدار ہوں اور ہوش میں آئیں۔

۵۔ اگر لوگوں کو اتحاد پسند نہ ہو اور دلی طور پر اسے نہ مانتے ہوں اس کے باوجود اگر اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ کسی سمجھوتے یا کسی صلح مصالحت پر پہنچ جائیں پھر بھی یہ ان کے لئے تفرقہ سے بہتر اور ان کے حق میں اچھا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ: دین خدا میں رنگ بدلنے کی کوشش نہ کرو اس لئے کہ اس حق بات پر اتحاد کرنا جسے تم ناپسند کرتے ہو اس باطل پر اختلاف کرنے سے بہتر ہے جسے تم پسند کرتے ہو۔ (

فایاکم والتلون فی دین الله فان جماعة فیما تکرهون من الحق...) (نہج البلاغہ، خ/۱۷۶)

مقصد یہ ہے کہ اللہ کے منتخب دین یعنی اسلام کو ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم نہ کریں، اگرچہ اپنے دینی بھائیوں سے آپ ناراض ہی کیوں نہ ہوں اور ان کا طریق کار آپ کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اصولوں میں آپ کے ہمفکروں کی دوستی ان لوگوں کی دوستی سے بہتر ہے جو اصولوں میں آپ کے ہمفکر نہیں ہیں۔ یعنی ایسی جگہوں پر اگر آپ ان کو راہ حق پر نہیں لا سکتے تو خاموشی اختیار کرنا اور اپنی انتخاب کردہ راہ پر چلتے رہنا اس سے بہتر ہے کہ آپ ایک مخالف مورچہ کھول لیں اور آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں۔

اگر آپ کہیں کہ: ہمارے بزرگوں نے حضرت علی علیہ السلام کی باتوں کو نہیں سنا اور فرقہ بندیوں میں لگ گئے اور ایک اسلام کو بہتر فرقوں میں تقسیم کر ڈالا اور آج ہم ان کی عاقبت نااندیشی اور ان کی بدکرداری کے نتائج میں گرفتار ہیں!

تو اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ: اول یہ کہ قرآن وسنت سے اپنے سلیقہ اور مزاج کے مطابق الگ الگ باتیں سمجھنے اور فرقہ بندی و مذہب سازی کرنے کے درمیان بہت فرق ہے۔ ائمہ اربعہ ابوحنیفہ، شافعی، مالک، اور احمد نیز خلفائے راشدین کے درمیان اتنا فرق نہیں تھا جتنا ان کے ماننے والوں میں ہے۔ دوم یہ کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مذاہب اربعہ کے ائمہ کے دلوں میں فرقہ سازی کا ارادہ بھی تھا تو ہم کو ان باتوں کے گڑے مردے نہیں اکھاڑنا چاہئے اور مردہ اختلافی مسائل کو پھر سے زندہ نہیں کرنا چاہئے۔ آگے اس بات کی طرف کچھ اور اشارہ کیا جائے گا۔

۶۔ جو لوگ اختلافات کو ہوا دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان کے رابطہ کو توڑنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام نے بڑے واضح انداز اور کھلے الفاظ میں ارشاد فرمادیا ہے اور فتنہ انگیزی اور تفرقہ کاری کو قتل کے برابر سمجھا ہے۔ آپ نے خود ہی سے شروع کیا ہے اور موجودہ تفرقہ اندازی کرنے والے کو نہ صرف یہ کہ اس سزا کا مستحق قرار دیا ہے بلکہ جو شخص تفرقہ کا نعرہ لگاتا ہے اور مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے میں آگے آگے ہے اسے بھی قتل کا مستحق گردانتے ہیں۔ لہذا آپ نے فرمایا ہے:

''(غیر منصوص مسائل میں) اسلام کے سواد اعظم کے ساتھ رہو کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے گوشہ نشینی اور تنہا روی سے پرہیز کرو کیونکہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والا شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے، جیسا کہ اگر کوئی دنبہ اپنے گلہ سے الگ ہو جائے تو وہ بھیڑئے کا لقمہ بن جاتا ہے۔ یاد رکھو جو بھی یہ نعرہ لگائے وہ قتل کا مستحق ہے اس کو قتل کر ڈالو چاہے وہ میرے عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو'' (نہج البلاغہ، خ/۱۲۷)

ظاہر ہے کہ تفرقہ کی نعرہ بازی فتنہ کھڑا کر دیتی ہے اور اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے: ''والفتنة اشد من القتل : فتنہ انگیزی قتل سے بھی بدتر ہے'' (بقرہ/۱۹۱) کیونکہ فتنہ انگیزی سے لوگ مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ البتہ فتنہ انگیزی کی تشخیص دینا فقیہ عادل کی ذمہ داری ہے۔

۷۔ جو لوگ فتنہ انگیزی اور گروہ بندی کرتے ہیں ممکن ہے کہ اپنے زعم باطل میں اپنے برے کردار کی کچھ توجیہ کریں اور ہوسکتا ہے قرآن کی آیتوں سے دلائل لانے کی کوشش کریں۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام نے ان کے عمل اور ان کی توجیہ کو واضح طور سے بیان فرمادیا ہے:

''جو لوگ تفرقہ کے لئے اکٹھا ہوئے ہوں وہ مسلمانوں کے گروہ سے جدا ہو جاتے ہیں؛ یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا پیشوا سمجھتے ہیں نہ یہ کہ قرآن ان کا پیشوا ہو۔ (نہج البلاغہ، خ ۱۴۷)

اس جملہ میں حضرت علی علیہ السلام نے ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو لوگ قرآن کو اللہ کے طرف سے نازل ہونے والی وحی مانتے ہیں اور اسی سے استناد کرتے ہیں انھیں چاہئے کہ اپنے ذہن کو ہر طرح کی سنی یا پڑھی ہوئی باتوں سے پاک کریں اور پاک ذہن کے ساتھ قرآن کے حقائق کو سمجھیں اور پھر قرآن سے اپنی سمجھ کو دیگر مذاہب کے عقائد و افکار سے ملائیں اور دیکھیں کہ ان کی کتنی باتیں قرآن کے مطابق ہیں اور کتنی باتیں قرآن کے مخالف ہیں۔ اور جو لوگ اس کے برخلاف عمل کرتے ہیں اور تفرقہ اور مذہب سازی کے لئے جمع ہوتے ہیں، یعنی پہلے اپنے عقائد اور افکار کو ایجاد کرتے ہیں اور پھر ان کو قرآن سے تطبیق دینے کوشش کرتے ہیں یہ لوگ وہ ہیں جو اپنے افکار کو قرآن پر تحمیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے افکار قرآن کی نہیں بلکہ قرآن ان کے افکار کی پیروی کرے۔

۸۔ جب دوسرے لوگ تجربہ گاہوں میں تجربہ کے لئے بیٹھے تھے اور سیمیناروں میں تحقیق اور درس و کلاس میں بحث و تدریس میں مشغول تھے اور اس نتیجہ تک پہنچے تھے کہ وہ دریاؤں کی تہوں اور آسمانوں کی بلندیوں پر قابض ہوگئے دنیا کو اپنی مصنوعات و ایجادات سے منور کر دیا درد اور اس کی دوا کو پہچان لیا اور آواز اور تصویروں کے نقل و انتقال کے ذریعہ پوری دنیا کو متصل کر دیا؛ یہی وقت تھا کہ جب کچھ مسلمان اپنی محفلوں میں بیٹھ کر کچھ صحابہ کے بہشتی یا دوزخی ہونے پر بحث و تحقیق کر رہے تھے! وہ صحابہ جو چودہ سو سال پہلے اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اللہ نے یقیناً ان کے لئے جنت یا دوزخ کا فیصلہ کر دیا ہوگا۔ کبھی کبھی ایسی بحثوں کا نتیجہ یہ تھا کہ متعدد نظریے پیدا ہوئے اور اختلاف و انتشار پھیل گیا جب کہ بحث کرنے والوں میں سے کوئی بھی اپنے نظریہ کو تاریخی اور روائی اعتبار سے مستند نہیں کرتا تھا اور شاید ان دونوں کے معتبر اور معتمد منابع انھیں لوگوں کے قبضہ میں تھے جو یونیورسٹیوں یا اکیڈمیوں

میں بیٹھ کر بحث وتحقیق کر رہے تھے۔ اگر دونوں کی بات کسی معتبر منبع سے جڑی ہوتی تو ایک ہی مسئلہ میں کئی قول پید اہونے ہی نہ پاتے۔ مختلف اقوال پیدا ہونے کی وجہ یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ ان کے منابع معتبر نہیں تھے یا یہ کہ تعصب اور کسی کی اندھی تقلید کر رہے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ بحث کرنے والے شیعہ سنی دونوں کیونکہ محقق نہیں تھے اس لئے یہ بات دونوں قبول کرتے تھے کہ اگر سنی بھی کسی شیعہ گھرانے میں پیدا ہوتا تو وہ شیعوں ہی کی طرح بات کرتا اور انھیں کی طرح استدلال بھی کرتا یا اگر یہی شیعہ کسی سنی گھرانے میں پیدا ہوتا تو وہ بھی سنی ہی کی طرح سوچتا اور اسی کی طرح استدلال بھی کرتا! اس کے باوجود دونوں ہی آخر عمر تک اپنے عقیدہ کے اوپر اڑے رہتے۔ اس سے بھی تعجب کی بات یہ تھی کہ دونوں کے لئے قابل قبول منابع دونوں ہی کو اس بحث کو بڑھانے اور پھیلانے سے روکتے تھے!

نہج البلاغہ میں اسلامی اتحاد

ہمارے مقالہ کا عنوان نہج البلاغہ سے متعلق ہے اس لئے ہم اپنے استدلالات کو اس عظیم کتاب سے پیش کرتے ہیں:

الف: حضرت علی علیہ السلام نے عثمان اور قاتلین عثمان کے بارے میں اظہار نظر کیا ہے اور دونوں ہی کو لغزشوں اور غلطیوں کا مرتکب جانا ہے۔ آپ نے عثمان کو مستبد اور قاتلین عثمان کو بے صبر اور کم حوصلہ کہا ہے اور پھر آخر میں فرمایا ہے: ''اللہ ہے جو مستبدین اور کم حوصلہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے'' (نہج البلاغہ، خ/۳۰) یعنی تم لوگ ان کے لئے جنت وجہنم کا فیصلہ نہ کرو کیونکہ یہ کام اللہ نے کر دیا ہے۔

ب: امام علیہ السلام نے عثمان ابن حنیف کو لکھے ایک نامہ میں فدک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''ہاں! زیر آسمان کی تمام سرزمینوں میں سے صرف فدک ہمارے پاس تھا، کچھ لوگوں نے سخاوت اور کچھ نے بخل کیا اور اللہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (ہمارے درمیان کہ ہم نے سخاوت کی اور نظر انداز کیا اور دوسروں کے درمیان جنھوں نے بخل کیا اور ہم سے چھین لیا)۔ مجھے فدک وغیرہ سے کیا لینا ہے؟ کہ انسان کی ابدی جگہ تو قبر ہے، اور کل وہاں رہنا ہے۔ قبر میں انسان کی کہانیاں اور دنیا میں اس کا کیا دھرا سب نابود ہو جائے گا۔ ایسا گڑھا جسے جتنا بڑا کریں اور جتنا وسیع کریں اتنا ہی اس میں اینٹ پتھر اور دراڑیں اسے ستائیں گی اور اس کی وسعت کو تنگ کر دیں گی'' (نہج البلاغہ، نامہ/۴۵)

ج: جب خوارج نے آپ کے خلاف خروج کیا اور آپ سے جنگ پر کمر بستہ ہو گئے تو فرمایا: ''میں تمھارے سلسلہ میں اللہ کے فیصلہ کا انتظار کر رہا ہوں'' (نہج البلاغہ، خ/۴۰)

د: جنگ جمل کے بعد عائشہ کے بارے میں اظہار نظر کیا اور آخر میں فرمایا: ''میری گفتگو کے باوجود عائشہ کا پہلے والا ہی احترام ہے اور اللہ کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ ہے'' (نہج البلاغہ، خ/۱۵۶)

ھ: معاویہ کو لکھے گئے ایک خط میں اس جملہ کو ارشاد فرماتے ہیں: ''**حتی یحکم الله بیننا و هو خیر الحاکمین**'': یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے'' (نہج البلاغہ، نامہ/۵۵)

لہٰذا جب خود حضرت علی علیہ السلام نے عائشہؓ، معاویہ اور عثمان نیز فدک کے غاصبین کے بارے میں فیصلہ کو اللہ کے حوالے کر دیا ہے اور اللہ کے فیصلہ کو ہمارے اور آپ کے فیصلہ سے بہتر سمجھا ہے تو ہم کیوں اپنا وقت ایسے امور میں لگائیں جو ہم سے متعلق نہیں ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ ان رفتار و گفتار کے بارے میں بحث کریں جن کے ذریعہ انسان بہشتی یا دوزخی ہو جاتا ہے اور اسلام کے جزا و سزا کے معیاروں کو پہچانیں اور پھر ان کے مطابق عمل کریں اور یہی زیادہ ضروری اور اہم ہے۔

۹۔ حضرت علی علیہ السلام نے ایسی نصیحتیں اس زمانے والوں بلکہ تمام زمانے والوں کے لئے کی ہیں کہ اگر ہمارے بزرگ اس کو سنتے اور عمل کرتے تو کسی قسم کا اختلاف اور جھگڑا فساد پیدا نہ ہوتا اور دن دونی رات چوگنی سعادت و ترقی حاصل ہوتی اور ہم آج ساری خوش بختی اور ترقی کے وارث ہوتے۔ حضرت علی علیہ السلام ان نصیحتوں پر پہلے خود عمل کیا ہے حضرت علی علیہ السلام نے اسلامی اتحاد کی خاطر اپنے اور اپنی زوجہ کے حق سے چشم پوشی کی، اپنی محرومیوں اور دشمن کی روگردانیوں کو برداشت کیا اور مسلمانوں کے اتحاد کو اپنے، اپنی زوجہ کے اور اولاد کے اوپر مقدم سمجھا۔

مصری عالم کی بات

بہتر ہے کہ یہاں کچھ دیر کے لئے برادران اہل سنت کے ایک عالم کے ہاتھ میں قلم دے دیں۔ الازہر یونیورسٹی کے استاد 'عبدالمتعال صعیدی' اپنے ایک مقالہ ''حضرت علی اور تقریب بین المذاہب'' میں لکھتے ہیں:

''یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ کے لئے ایک بڑی فضیلت ہے کہ وہ سب سے پہلے تقریب بین المذاہب کی بنیاد ڈالنے والے تھے، تاکہ نظر اور رائے کا اختلاف کبھی انتشار و تفرقہ کا سبب نہ بنے اور مختلف گروہوں میں دشمنی پیدا نہ ہو؛ بلکہ اختلاف نظر کے باوجود اپنے اتحاد و اتفاق کو بچائے رکھیں اور بھائی چارگی سے زندگی گزاریں اور ہر شخص یا اپنے بھائی کو رائے و نظر میں آزاد چھوڑ دیں کیونکہ صاحب نظر کی رائے یا صحیح ہوگی اور وہ

ماجور ہوگا یا غلط ہوگی اور وہ معذور ہوگا۔ یا پھر تعصب کے بغیر اپنے بھائی کے ساتھ ایک مناسب انداز میں اختلافی موضوع پر گفتگو کریں اس طرح کہ حقیقت تک پہنچنا دونوں کا مقصد ہو نہ کہ دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا۔ اور یہ حضرت علی علیہ السلام کے فضائل میں سے ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے قرابت اور خاندانی شرافت نیز ایمان میں سبقت سے کم نہیں ہے؛ آپ نے ہی جہاد بالعلم، جہاد بالمال اور جہاد بالسیف کیا اس کے بعد صعیدی صاحب وضاحت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان سب سے پہلا اختلاف، خلافت کے بارے میں ہوا اور حضرت علی علیہ السلام نے یہ جانتے ہوئے ابوبکرؓ عمر اور عثمان کے ساتھ مدارا کیا کہ آپ خلافت کے لئے دوسروں سے زیادہ حقدار ہیں۔ اوران کی کسی طرح کی مدد کرنے میں دریغ نہیں فرمایا تا کہ آپ اختلاف رائے کے موقع پر اتحاد و مدارا کے سب سے اعلی نمونہ ہوں۔ اور جب خلافت کے لئے مسلمانوں کا اصرار زیادہ ہوا تو آپ نے کسی پر بھی اپنی خلافت قبول کرنے کے لئے جبر نہیں کیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایثار اور اعلی ظرفی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ خوارج کے خلاف بھی اس وقت تک جنگ کا فیصلہ نہیں کیا جب تک انھوں نے آپ کے اوپر شمشیر نہیں کھینچی۔ اور آپ نے حکم دیا کہ آپ کے قاتل سے اچھا برتاؤ کیا جائے اور اسے ایک ضربت سے زیادہ نہ لگائیں'' (ہمبستگی مذاہب اسلامی، عبدالکریم بی آزار شیرازی، ص/۲۰۷، نقل از رسالۃ الاسلام شمارہ ۴ سال سوم، ص/۴۳۴)

خطبہ شقشقیہ

خطبہ شقشقیہ نہج البلاغہ کا ایک مشہور خطبہ ہے اور اہل سنت میں سے ابن ابی الحدید، محمد عبدہ، فخر رازی، ملا سعد تفتازانی، قاضی یوسف اور محی الدین خیاط نے اس کی شرح کی ہے اور ابن اثیر اور فیروز آبادی نے اس خطبہ کو حضرت علی علیہ السلام کا خطبہ مانا ہے۔

امام علیہ السلام نے خطبہ کے شروع میں گزشتہ خلفاء کا گلہ وشکوہ کیا ہے اور ان کو ایسے صفات سے متصف کیا ہے جن کی تاریخ اور روایات بھی تائید کرتی ہیں۔ درمیان خطبہ میں ایک دیہاتی آگے آیا اور آپ کو ایک خط دیا آپ اس خط کو پڑھنے میں مشغول ہو گئے اور اپنے کلام کو منقطع کر دیا۔ ابن عباس اس مجلس میں حاضر تھے انھوں نے کہا مولا اپنی گفتگو کو جاری رکھیں تو امام علی علیہ السلام نے جواب میں اپنے مشہور جملہ ''شقشقة هدرت ثم قرت'' کو ارشاد فرمایا اور اپنی بات کو دوبارہ شروع نہیں کیا۔ گویا حضرت علی علیہ السلام فرمانا چاہتے ہیں کہ: جو میں نے کہا ہے اگر چہ وہ ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن اس کو مزید بیان کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا، کیونکہ اس بات کی یاد کدورتوں کو بھی یاد دلائے گی، ایک حقیقت تھی وہ پردہ وجود پر آئی اور ختم ہوگئی۔ وہ تینوں مر چکے ہیں اور قیامت میں ایک عدالت

ہے اور اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ آپ ان باتوں کے پیچھے نہ جائیں اور اس کے بارے میں سوال نہ کریں اور اس سلسلہ میں زیادہ گفتگو نہ کریں۔

حضرت علی علیہ السلام اور ایک اسدی شخص

اختلاف انگیز باتوں سے پرہیز کرنے کے لئے خطبہ شقشقیہ سے بھی زیادہ واضح وہ جواب ہے جو حضرت علی علیہ السلام نے ایک اسدی شخص کو دیا۔ قبیلہ بنی اسد کا ایک شخص آپ کا سبھی رشتہ دار تھا اس نے آپ سے ایک مرتبہ پوچھا کہ جبکہ آپ بنی ہاشم کے لوگ دوسروں سے خلافت کے زیادہ حقدار تھے تو آخر کیا وجہ تھی کہ آپ کو نظر انداز کیا گیا؟

آپ نے جواب میں فرمایا: اے برادر بنی اسد! تم بہت کم حوصلہ ہو اور غلط راستہ پر چل پڑے ہو۔ اس کے باوجود تم میرے رشتہ دار ہو اور تمھارا حق سوال بھی محترم ہے اور تم نے سوال کر بھی لیا ہے۔ اب اگر جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو! ہماری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ سے قرابت اور خاندانی شرافت کے باوجود انھوں نے اس حق کو ہم سے اس لئے چھین لیا کیونکہ اس میں ایک خودغرضی تھی جس پر ایک جماعت کے نفس مرمٹے تھے اور دوسری جماعت نے چشم پوشی سے کام لیا تھا۔ لیکن بہرحال اللہ حاکم ہے اور روز قیامت اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانا ہے۔ (آپ نے عربی کے ایک شعر سے تقریب ذہن کی جس کا مطلب یوں ہے):

اس لوٹ مار کی بات چھوڑو جس کا شور وغل ہوگیا تھا
اب صرف ان اونٹنیوں کی بات کرو جو اپنے قبضہ میں رہ گئی ہیں

اب آؤ اس مصیبت کی طرف دیکھو جو ابوسفیان کے بیٹے کی طرف سے آئی ہے کہ زمانے نے رلانے کے بعد ہنسا دیا ہے اور بخدا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تعجب تو اس حادثہ پر ہے جس نے تعجب کا بھی خاتمہ کر دیا ہے اور کجی کو بڑھا دیا ہے۔ قوم نے چاہا تھا کہ نور الٰہی کو اس کے چراغ ہی سے خاموش کر دیا جائے اور فوارہ کو چشمہ ہی سے بند کر دیا جائے۔ میرے اور اپنے درمیان زہریلے گھونٹوں کی آمیزش کر دی کہ اگر مجھ سے اور ان سے ابتلا کی زحمتیں ختم ہوگئیں تو میں انھیں خالص حق کے راستے پر چلاؤں گا اور اگر کوئی دوسری صورت ہوگئی تو تمھیں حسرت وافسوس سے اپنی جان نہیں دینی چاہئے۔ اللہ ان کے اعمال سے خوب باخبر ہے۔ (نہج البلاغہ، خ ۱۶۲)

ہمیں ان سوال وجواب سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں جنگ صفین سامنے تھی حضرت علی علیہ السلام نے اس شخص کو اس زمانے کے موضوع سے آگاہ کیا۔ اس کا سوال تقریباً تیس سال پرانا تھا اور نہ اہم تھا نہ

ہی مفید۔اس کا ایک مختصر سا جواب دیا اور معاویہ کی حکومت طلبی اور خود خواہی کو اہم مسئلہ بتایا۔لہٰذا اگر حضرت علی علیہ السلام آج ہمارے درمیان آجائیں اور ہم جنگ صفین کے سلسلہ میں ان سے سوال کریں تو ان کا جواب یہی ہوگا کہ آج کے انسان کی داستان جس پر اسے نہیں معلوم کہ خون کے آنسو روئے یا قہقہے لگائے، یہی ہے کہ دنیا کے مسلمان دنیا کی ڈیڑھ ارب تعداد میں ہونے کے باوجود، دنیا کے بہترین دین اور بہترین زبان کے باوجود، دنیا کے بنیادی ذخیروں کے مالک ہونے کے باوجود، دنیا کے جنگی اسٹراٹجیک خطوں پر قابض ہونے کے باوجود اور دنیا کی سربراہی اور سرداری کا بہترین ماضی رکھنے کے باوجود کس طرح مٹھی بھر صہیونیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔اور سب جانتے ہیں کہ اس کی سب سے بڑی بلکہ واحد وجہ یہ ہے کہ: اسلامی متحدہ امت مختلف مذہبوں، حکومتوں اور ٹکڑوں میں بٹ کے رہ گئی ہے اور ان کے درمیان اختلاف وانتشار پیدا ہوگیا ہے۔اور اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ہاتھ سے نکل جانے والی شان وشوکت اور عزت وآبرو کو دوبارہ حاصل کریں تو ان کا متحد اور ایک ہونا ضروری ہے۔لیکن اسے جانتے ہوئے بھی اس کے سلسلہ میں کوتاہی کرتے ہیں۔آخر بیداری کی صبح کب رونما ہوگی؟ " **أليس الصبح بقريب** "۔

۱۰۔اتحاد قائم کرنے اور انتشار سے بچنے کا ایک راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی گفتگو میں اس طرح ادب واحترام کا خیال رکھیں کہ مقابل کے وقار اور آبرو پر حملہ نہ کریں۔اور کہنے والے کے لہجہ سے بیہودگی اور بداخلاقی نہ جھلکے چونکہ کہنے والے کی بات کتنی بھی برحق کیوں نہ ہو اگر اس میں سختی اور تلخی کی ملاوٹ ہوگی تو مقصود حاصل نہیں ہوگا۔بلکہ عین ممکن ہے کہ صلح وآشتی ہی کو لے ڈوبے اور کینہ ودشمنی پیدا کردے۔حضرت علی علیہ السلام نے اس بارے میں بہت سی باتیں ارشاد فرمائی ہیں:

۱۔متقی انسان کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ گالی گلوج اور دشنام طرازی سے دور رہتا ہے اور اس کے کلام میں نرمی ہوتی ہے۔(نہج البلاغہ، خ/۱۹۳)

۲۔بری اور گری باتوں سے بچو کیونکہ یہ دل کو کینہ وکدورت سے بھر دیتی ہیں۔(غرر ودرر آمدی، شرح آقا جمال خوانساری، ۲/۲۹۸)

۳۔نرمی سے بات کرنا عبادت ہے۔(غرر ودرر آمدی، شرح آقا جمال خوانساری، ۲/۲۹۷)

۴۔بدزبانی میں موت کا پیغام ہے۔(غرر ودرر آمدی، شرح آقا جمال خوانساری، ۳/۴۰۳)

۵۔اچھا بولو تاکہ اچھا سنو۔(غرر ودرر آمدی، شرح آقا جمال خوانساری، ۲/۲۶۶)

۶۔زبان کی دھار تلوار کی دھار سے تیز ہوتی ہے۔(غرر ودرر آمدی، شرح آقا جمال خوانساری، ۳/۴۰۳)

۷۔اپنی زبان کونرم گفتگواور سلام کرنے کی عادت دوتا کہ تمھارے دوست زیادہ اور دشمن کم ہوں۔ (غرر ودرر آمدی،شرح آقا جمال خوانساری،۴۲۹/۴)

۸۔کتنی ایسی جنگیں ہیں جوصرف ایک لفظ کہنے کی وجہ سے شروع ہوئی ہیں۔(غرر ودرر آمدی،شرح آقا جمال خوانساری،۶۶/۴)

۹۔جس کی گفتگو میں نرمی ہو دلوں میں اس کی محبت آجاتی ہے۔(غرر و درر آمدی،شرح آقا جمال خوانساری،۱۹۳/۵)

۱۰۔بدزبانی قدر گھٹاتی ہے اوراخوت کو برباد کردیتی ہے۔(غرر ودرر آمدی،شرح آقا جمال خوانساری، ۱۴۴/۴)

۱۱۔بدکلامی، پست انسانوں کی عادت ہوتی ہے۔(غرر و درر آمدی، شرح آقا جمال خوانساری، ۳۳۹/۴)

۱۲۔انسانیت کی ترازو،زبان ہے۔(غرر ودرر آمدی،شرح آقا جمال خوانساری،۳۳۹/۱)

شیعہ سنی علماء کے درمیان نرم و پرسکون گفتگو

شیعہ سنی کے درمیان ہونے والی مختلف بحثوں اور خط وکتابت میں صرف وہی مفید ہوئی ہیں جونرم لہجہ اور ادب واحترام کے ساتھ انجام پائی ہیں۔

انھیں میں سے خطوط کا ایک سلسلہ وہ ہے جوشیعوں کے بزرگ عالم دین جناب سید عبدالحسین شرف الدین اور مصر کے روحانی قائد شیخ الازہر جناب شیخ سلیم بشری کے درمیان انجام پایا ہے۔ یہ سلسلہ پچپن خطوط پر مشتمل ہے جو دونوں طرف سے لکھے گئے ہیں؛ شیخ سلیم صاحب سوال کرتے تھے اور شرف الدین صاحب جواب دیتے تھے (اللہ دونوں کو جزائے خیر عنایت فرمائے)۔ یہ کتاب ''مراجعات'' کے نام سے ایک سودس خطوط اور ایک مقدمہ پر مشتمل بارہا عربی،اردو،فارسی،انگلش میں چھپ چکی ہے۔

طرفین کے ادب واحترام کا نمونہ پیش کرنے کے لئے ہم اس سلسلہ کا سب سے پہلا خط قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ پہلا خط جناب شیخ سلیم نے ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ کو لکھا اور اس طرح اس کا آغاز کیا:

اللہ کا درود اور رحمت و برکت ہو علامہ شریف سید عبدالحسین شرف الدین موسوی پر!

میں ماضی میں شیعہ حقائق کو درک نہیں کر پایا ہوں کیونکہ کبھی ان کا ہم صحبت نہ ہوسکا۔ میری بڑی خواہش

تھی کہ شیعوں کے بزرگوں سے ہمکلام ہوں اور شیعہ عوام سے بھی بات کروں اور اس طرح ان کے عقائد سے آشنائی حاصل کروں۔ اب جبکہ اللہ نے یہ توفیق مجھے عنایت کی ہے کہ میں آپ کے دریائے علم کے ساحل تک پہنچوں اور اپنی پیاس بجھا سکوں؛ تو مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے آپ کے چشمہ علم کے آب گوارا سے سیراب فرمائے گا... میں اس سے پہلے سنتا تھا کہ آپ شیعوں کا خیال ہے کہ اپنے سنی بھائیوں سے دور رہنا چاہئے اور ان کے ساتھ رہن سہن سے پرہیز کرنا چاہئے۔ میں نے سنا تھا... میں نے سنا تھا... لیکن میں نے آپ کو خوش مزاج انسان پایا آپ بحث ومباحثہ میں دقیق ہیں، نیک نیت ہیں، مزاح میں لطیف ہیں اور اپنی شرافت وعزت کا خیال رکھتے ہیں... اور آپ شیعوں کی یہ خوش اخلاقی اس لائق ہے کہ آپ کے ساتھ بیٹھا جائے اور ہر ادب والا اس کی آرزو کرے... اگر آپ اجازت دیں کہ آپ کے علم کے بحر زخار میں غوطہ ور ہوں تو میں ان مشکل اور دقیق مسائل کو حل کروں جو مدتوں سے میرے دل و دماغ میں پل رہے ہیں۔ اور اگر آپ اجازت نہ دیں تو آپ صاحب اختیار ہیں۔

اس بحث کے اندر مجھے لغزشوں یا برائیوں کی تلاش نہیں ہے، میں تنبیہ یا پریشان کرنا بھی نہیں چاہتا ہوں؛ بلکہ حقیقت کی تلاش میں ہوں جو مجھ سے گم ہوگئی ہے۔ اگر مجھے حقیقت مل گئی تو اس کا اتباع کرنا مناسب ہے ورنہ اس شعر پر عمل کروں گا:

نحن بما عندنا و انت بما

عندک راض و الرای مختلف

''ہم اپنی چیزوں پر اور آپ اپنی چیزوں پر راضی رہیں اگرچہ ہمارے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے''

اگر آپ اجازت دیں تو بحث کو امامت خاصہ اور امامت عامہ سے شروع کریں۔ اور میں پہلے سے ہی کسی طرح کی خطا وغلطی کی معافی چاہتا ہوں۔

سید شرف الدین نے اس طرح جواب دیا:

اللہ کا درود اور رحمت برکت ہو ہمارے مولا شیخ الاسلام پر!

آپ نے اپنے محبت آمیز خط سے اس طرح مجھے شرف بخشا ہے کہ زبان اس کی شکرگزاری سے عاجز ہے اور میں اپنی پوری عمر میں اپنے کچھ فرائض کو بھی انجام دینے سے عاجز ہوں۔ اپنی تمناؤں کو آپ نے میرے پاس پایا ہے اور مجھ پر نگاہ التفات ڈالی ہے جبکہ آپ خود امید والوں اور بے کس ولاچاروں کی پناہ گاہ ہیں۔ میں شام سے آپ کی تمناؤں کے مرکب پر سوار ہو کر آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں اور آپ کی پناہ میں اپنا بار سفر اتارا ہے

تا کہ آپ کے علم سے استفادہ کروں اور آپ کے فضائل کے چند قطرے حاصل کرسکوں اور اس دن کا منتظر ہوں جب اللہ کے مدد سے زندہ امیدوں اور حاصل شدہ آرزوؤں کے ساتھ آپ سے رخصت ہوں۔ آپ کو سوال کا حق حاصل ہے، آپ حکم فرمائیں، روکیں ٹوکیں۔ جس بارے میں چاہیں سوال فرمائیں، فضل وشرف آپ سے مخصوص ہے۔ آپ کی بات حق ہے اور آپ کا حکم عدل وانصاف سے پھر پور ہے۔ والسلام علیک۔

سچ بتائے یہ چودہ سو سال جو گزر گئے اور مزید چودہ سو سال جو گزر جائیں گے ان میں اگر شیعہ سنی مباحثات اور مکالمات اس طرح پاک صاف اور خوش مزاجی وخوش اخلاقی کے ساتھ انجام پائیں تو کیا کسی طرح کا جھگڑا فساد ہوگا؟ کیا کوئی حقیقت چھپی رہ سکتی ہے؟ کیا کوئی الزام تراشی ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں!

''دارالتقریب'' میں اتحاد کی تجلی

شیعہ سنی کے باہمی حسن برتاؤ اور اخلاق مندی کا ایک اور نمونہ 'دارالتقریب المذاہب الاسلامیۃ' ہے جو نصف صدی پہلے انجام پایا اور چوتھائی صدی تک جس کا چرچا رہا۔ اس اسلامی ثقافتی تنظیم کے اندر علمائے اہل سنت میں کے بزرگ عالم شیخ عبدالمجید سلیم، مصر کے بزرگ مفتی شیخ حسن البناء، اخوان المسلمین کے بانی وسرپرست علامہ شیخ محمد شلتوت اور علمائے شیعہ میں سے نجف کے مرجع آیۃ اللہ محمد حسین آل کاشف الغطاء، اور آیۃ اللہ سید شرف الدین (جن کا تذکرہ بالاسطور میں ہوا ہے) شریک تھے۔ اور اس بابرکت اقدام کی بنیاد پر قم، مشہد، قاہرہ کے علاوہ دنیا کے دیگر خطوں میں پروگرام منعقد ہوئے اور فریقین کے علماء ساتھ ساتھ بیٹھے۔ تفرقے، اتحاد میں بدلے اور الزام تراشیاں ختم ہوئیں۔ شیعوں کو یہ احساس ہوا کہ اہل سنت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے اہل بیت علیہم السلام سے لگاؤ رکھتے ہیں اور اہل سنت کو پتہ چلا کہ شیعوں کہ یہاں الگ سے کوئی قرآن نہیں ہے اور وہ حضرت علی علیہ السلام کو پیغمبر نہیں سمجھتے۔ اس طرح اختلافی مسائل واضح ہوجانے سے بہت سے اختلافات خود بخود ختم ہوگئے۔ وہ اختلافات جن کو ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے غیروں نے پیدا کیا تھا اور ہر سال کسی نہ کسی کو اپنا آلہ کار بناتے تھے تا کہ وہ کسی فتنہ کو رد شیعہ یا رد سنی کے عنوان سے اچھالے۔ یا ان کے علماء، مستشرق کے نقاب میں آئیں اور سنی کو شیعہ سے بہتر بتائیں جیسے 'گلڈ ٹسیہر' جو اپنا تکیہ کلام ہی 'شیعہ اسلام' اور 'سنی اسلام' قرار دیتا تھا اور اس طرح دو اسلام بنا دیتا تھا۔ جبکہ وہ خود نہ سنی کو پسند کرتا تھا اور نہ شیعہ کو۔

'دارالتقریب' کے قابل قدر نتائج

علماء کے قریب ہونے سے اختلافات ختم ہوئے اور بہت سے مشکلات حل ہوئے۔ شیخ 'الازہر' نے اپنا مشہور فتویٰ صادر کیا جس میں انھوں نے دیگر مذاہب اسلامی کی طرح مذہب شیعہ کو بھی قابل اتباع سمجھا۔ اور الازہر یونیورسٹی میں مذہب تشیع کی تدریس کے لئے ایک کرسی کی پیشکش ہوئی۔ تقریب کی تاسیس کے دو سال بعد 'رسالۃ الاسلام' کے عنوان سے ایک رسمی میگزین کی تاسیس ہوئی، اور اس میں شیعہ سنی بزرگ علماء نے اپنے علمی و دینی افکار کو نشر کرنے کا کام شروع کیا۔ یہ میگزین علمی، اخلاقی، تاریخی، فقہی، فلسفی اور اصلاحی مقالات کا ایک خزانہ تھی اور سب سے اہم وہ مقالات تھے جو تفسیر قرآن کے عنوان سے عظیم مفسر شیخ محمود شلتوت نے مرقوم کئے تھے؛ اور یہ فرقہ وارانہ تعصب سے ہٹ کر ایک تفسیر تھی۔ اس میگزین میں علماء کے اخلاص اور ایمان کی قوت بخوبی نظر آتی ہے اور حد درجہ قابل استفادہ ہے۔

۱۱۔ جو نشستیں اتحاد کے عنوان سے منعقد ہوتی ہیں یا جو مقالات اس موضوع پر لکھے جاتے ہیں ان میں اختلافی مسائل کو زیادہ کھل کو بیان نہیں ہونا چاہئے چاہے کہنے یا لکھنے والے کا ارادہ یہ ہو کہ آخر میں اتفاق و اتحاد تک پہنچیں گے اور اختلاف کی مذمت کریں گے۔ لیکن اختلاف کی تشریح و توضیح ہی سننے یا پڑھنے والے کے دل میں ایک غلط اثر ڈال دے گی اور اغیار کی سیاستوں کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ ممکن ہے بعض سننے یا پڑھنے والے جذبات کے تابع فرمان ہوں اور آخر کی نتیجہ گیری سے ان کے دل و دماغ پر پڑا ہوا وہ اثر زائل نہ ہو جو اختلافات کی توضیح کے سبب وجود میں آیا ہے۔ ان فلموں کی طرح جن میں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک جرم کرنے کے طریقوں کو مختلف فنکاریوں اور اداکاریوں کے ذریعہ بتایا جاتا ہے اور آخر میں ذرا سی دیر کے لئے مجرم کو جیل میں دکھا دیا جاتا ہے۔ تجربہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ جو اثر شروع کے مناظر سے دل پر بیٹھتا ہے وہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ آخری منظر کا ہلکا سوختہ اس کے اثر کو ختم نہیں کر سکتا۔ 'رسالۃ الاسلام' میں اس بات کی رعایت کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں نہج البلاغہ سے ہماری دلیل بھی وہی ہے جو اس مقالہ میں نویں نمبر کے تحت بیان ہوئی ہے۔

بے بیاد تہمتیں

یہاں حسن اختتام کے طور پر دو باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو راقم الحروف کی نظر میں زیادہ تر تہمت زنی اور الزام تراشی کا مصداق ہیں نہ کہ حقیقت کا: کچھ تہمتیں شیعوں پر لگائی جاتی اور کچھ اہل سنت پر۔ حسن

جارہا ہے:

ا۔شعوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ درحالیکہ حضرت علی علیہ السلام کو اپنا واجب الاطاعت پیشوا قرار دیتے ہیں اور درحالیکہ اہل سنت سے ان کے اختلافات اس سلوک کے سبب ہیں جو حضرت علی علیہ السلام نے اپنے سے پہلے کے تین خلفاء کے ساتھ روا رکھے، اس کے باوجود یہ لوگ ان تینوں حضرات کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت خود حضرت علی علیہ السلام کی طرح نہیں ہیں یعنی اس میں کچھ افراط کرتے ہیں اور غم وغصہ میں خود حضرت علی علیہ السلام سے آگے لگتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ان تینوں شخصیتوں کے بارے میں ہمارا فیصلہ وہی ہے جو ہمارے امام وپیشوا کا ہے۔حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے سامنے ۲۳ سال اور اس کے بعد ۲۵ سال تک ان کے ساتھ رفت وآمد کی ہے، ان کے ساتھ گھریلو رابطہ اور سبھی قرابت رکھی ہے۔تمام جنگوں میں شوری میں، اسلامی مسائل میں اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی گھریلو رفت وآمد میں ان چاروں حضرات کا نام آتا ہے۔ ابوبکر کو حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ علیہا السلام کا جہیز کے خریدنے کی ذمہ داری دی جاتی ہے۔عمر اپنی خلافت کے زمانے میں بارہا حضرت علی علیہ السلام سے مشورہ کرتے ہیں یا حضرت علی علیہ السلام بغیر دریافت کئے اپنی رائے کو پیش کیا ہے اور عمر نے تصدیق کی ہے۔ ان مشوروں میں سے تین موارد نہج البلاغہ میں بھی تفصیل سے آئے ہیں (نہج البلاغہ، خ ۱۳۴ کا پہلا مورد؛ خ ۱۴۶ کا دوسرا مورد؛ حکمت ۲۷۰ کا تیسرا مورد)۔حتی تاریخ میں چالیس مقامات سے زیادہ پر آیا ہے کہ عمر نے حضرت علی علیہ السلام کی رائے سننے کے بعد کہا: **لولاک لافت ضحنا** (نہج البلاغہ، حکمت ۲۷۰)، **لولا علی لهلک عمر، ما بقیت لمعضلة لیس فیها ابو الحسن**؛ وغیرہ۔

حضرت عثمان کے بارے میں تو حضرت علی علیہ السلام کچھ زیادہ ہی دلسوزی اور خیر خواہی فرماتے ہیں: جب لوگ حضرت عثمان کے اوپر مشتعل ہو رہے تھے تو عثمان نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ آپ مدینہ سے باہر چلے جائیں، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لوگ چونکہ حضرت علی علیہ السلام کو چاہتے ہیں اس لئے ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔حضرت علی علیہ السلام اس بات کو قبول کر لیتے ہیں اور مدینہ سے باہر چلے جاتے ہیں حتی یہ عمل کئی بار تکرار ہوتا ہے۔آپ ایک بار حضرت عثمان کے پاس گئے اور فرمایا:

لوگوں نے میرے پیچھے اجتماع کیا ہے اور انھوں نے مجھے اپنے سفیر کے عنوان سے تمھارے پاس بھیجا ہے، اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تم سے کیا کہوں۔ مجھے کوئی ایسی بات نہیں معلوم جسے تم نہیں جانتے اور تمھاری ایسے راستہ کی طرف راہنمائی نہیں کر رہا جسے تم نہ جانتے ہو۔ جو ہمیں معلوم ہے وہ تمھیں بھی معلوم ہے۔ ہم نے تم سے

آ گے کوئی ایسی بات نہیں سیکھ لی جو تمھیں بتائیں، اور کہیں خلوت نہیں کی جس کا ماجرا تم کو سنائیں۔ جو ہم نے دیکھا اور سنا ہے تم نے بھی دیکھا اور سنا ہے، اور تم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے صحبت میں تھے جیسا کہ ہم تھے، ابوبکر اور عمر حق پر عمل کرنے کے بارے میں تم سے زیادہ حقدار نہیں تھے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے رشتہ داری کے سبب ان دونوں کے مقابل زیادہ نزدیک ہو، تم آنحضرت کی دامادی تک پہنچے ہو جبکہ وہ نہیں پہنچے ہیں، تمھیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں اپنے بارے میں کچھ سوچو! تم نابینا نہیں ہو کہ میں بینائی دوں اور نادان نہیں ہو کہ تمھیں دانا کروں... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کو میں نے فرماتے سنا کہ: قیامت کے روز ظالم حاکم کو لایا جائے گا بغیر کسی مددگار اور بغیر کسی عذر خواہ کے، پھر دوزخ کی آگ میں ڈال دیں گے تا کہ چکی کے پاٹ کی طرح دوزخ میں چکر کھائے...اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس امت کے ایسے مقتول پیشوا نہ بنو جس کے سبب قیامت تک قتل وخونریزی کا دروازہ کھل جائے، اسلام کا مسئلہ امت پر مشتبہ ہو جائے گا اور فتنے کھڑے ہو جائیں گے حق و باطل میں امتیاز نہ ہو پائے گا لوگ انھیں تھپیڑوں میں تہ و بالا ہوتے رہیں گے (حتی 'پیراہن عثمان' کا نعرہ ہر فتنہ وفساد کا نعرہ بن جائے گا)۔ خبردار اپنے بڑھاپے اور عمر کے اختتام پر مروان کے آلہ کار نہ بنو جو تمھیں اپنی من چاہی راہ پر لے جارہا ہے۔ (نہج البلاغہ، خ ۱۶۴)

یہ ٹھیک ہے کہ ہم چودہ سو سال بعد، اور راویوں اور مورخین کے تعصب اور بیجا دوستی و دشمنی کی وجہ سے خلفائے راشدین کے اصلی چہرے کو اور ان کے باہمی روابط کو درک نہیں کر سکتے؛ کیونکہ مذکورہ اسباب حقیقت میں رد وبدل کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود قرآن، نہج البلاغہ اور فریقین کی معتبر کتابوں میں بہت سے واضح موقف دکھائی دیتے ہیں جن کے ذریعہ اپنے ذہن کو ماحول کے رنگ سے پاک کر کے حقیقت کو پیدا کیا جا سکتا ہے، البتہ بزرگوں کی غلطی یہی تھی کہ انھوں نے اپنے ذہن کو ماحول سے الگ نہیں کیا تھا۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ حضرت ابوبکر کی ہمراہی شیعہ سنی مسلمات میں سے ہے اور قرآن کریم اور معتبر تاریخ و روایات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں لیکن یہی مسلم مسئلہ حتی فریقین کے علماء کے یہاں دو متناقض زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔ علمائے اہل سنت اسے ابوبکر کی فضیلت وشرف کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کچھ شیعہ علماء اس کے برخلاف پیش کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت صرف ایک چیز ہے جسے تعصب، اندھی تقلید اور جعلی روایات نے چھپا رکھا ہے حتی علماء طبقہ بھی اس میں گرفتار ہے۔

۲۔ اہل سنت پر جو تہمتیں لگائی جاتی ہیں وہ اس طرح ہیں: شیعہ سنی اور ان کے پیشواؤں کے درمیان تقریباً چودہ سو سالوں سے نزاع چلا آرہا ہے۔ اس مدت میں ایک گروہ مسلسل حکومت وسلطنت پر قابض رہا ہے اور

قیادت و رہبری اور برتری کے درپے رہا ہے۔ انھوں نے مسلسل اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ جبر و فریب کاری سے کام لیا ہے، قید کرتے تھے، شکنجہ کرتے تھے، جلاوطن کرتے تھے، مار ڈالتے تھے، اس مقصد تک پہنچنے کے لئے وہ اسلام کا دکھاوا بھی کرتے تھے اور اس طرح انھوں نے اسلام کو اس کی اصل روح اور حقیقی مضمون سے خالی کر دیا۔ ان کے مقابل کچھ اور مسلمان بھی تھے جو ہمیشہ توحید کلمہ اور کلمہ توحید کی حفاظت کے لئے کوشاں تھے۔ ان لوگوں نے اتحاد کے خیال سے سکوت کی روش اختیار کی۔ اپنے مسلم حق سے چشم پوشی کر لیتے تھے اور ظلم و ستم حتی شہادت کو بھی قبول کر لیتے تھے تا کہ اسلام کا پرچم لہراتا رہے؛ ان کی جانبازی و فداکاری کربلا کے خونین واقعہ تک دکھائی دیتی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد میں امام زین العابدین، امام باقر، امام صادق اور امام موسی کاظم علیہم السلام نے اپنی عمر کو اسلام کی تبلیغ، ترویج اور توسیع میں لگا دیا۔ کبھی اللہ سے مناجات کی صورت میں، کبھی تفسیر قرآن کی صورت میں، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی احادیث بیان کرنے کی صورت میں اور کبھی مناظرہ اور احتجاج کی صورت میں۔ ان میں سے بہت سے صحیفہ سجادیہ اور دیگر ادعیہ و احتجاج کی کتب کی صورت میں موجود ہیں۔ امام سجاد علیہ السلام ایک معمولی سے مکان میں سادہ سی چٹائی پر مدینہ کے ایک گوشہ میں بیٹھتے تھے۔ امام صادق علیہ السلام بھی اسی سادہ طریقہ سے کھیتی کرتے تھے اور جسمانی محنت کشی اور پیشانی کی عرق ریزی کر کے چند روٹیاں حاصل کرتے تھے اور اپنے باقی اوقات کو اسلامی معارف کی نشر و اشاعت اور حقیقی اصول مکتب اسلامی کے شاگردوں کی تربیت میں لگاتے تھے۔ شہدائے اول، ثانی، ثالث و رابع کو دیکھئے جو اسلام کے دفاع اور علوی و جعفری معارف کے نشر کرنے کے جرم میں قید خانہ جاتے ہیں، ان کا بدن خاردار تازیانوں سے پاش پاش ہو جاتا ہے ان کے سر کو جسم سے جدا کرتے ہیں اور ان کے جسم کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے اور پھر ان کے راکھ کو ہواؤں اور فضاؤں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ابن سکیت کو دیکھ لیجئے جس کی زبان کو اولاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی محبت کے جرم میں گدی سے کھینچ لیا جاتا ہے اور پھر زدوکوب ہی کے درمیان وہ شہید ہو جاتے ہیں؛ جبکہ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے بے مثال عالم تھے، بلکہ شہیدین کی لمعہ و شرح لمعہ تو ایسی کتاب ہے جس کی نظیر سات سو سال بعد ابھی تک نہیں آئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ قائدین و پیروان کے اس گروہ کی نظر میں اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور شخصیت و خاندان سے بھی زیادہ عزیز، اسلام تھا، قرآن تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ تھے اور آل پیغمبر علیہم السلام تھی۔ یہ لوگ وفادار تھے اور اپنے جد کی راہ پر چل رہے تھے۔ دوسری طرف دوسرے گروہ کی نظر میں سب سے اہم ان کا عہدہ، تن پروری، آرام طلبی اور اولاد کی بے جا حمایت تھی چاہے وہ اولاد یزید و ولید ہی کیوں نہ ہو۔

اہل سنت پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دوسرے نمبر کے گروہ یعنی صاحبان اقتدار و سلطنت کی

حمایت کرتے رہے ہیں اوراس کے مقابل کے گروہ کوسرے سے نظر انداز کرتے ہیں اوران کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے چاہے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ الزام تراشی کرنے والے کہتے ہیں کہ اہل سنت حضرات صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کا نام تو احترام سے لیتے ہیں، ان سے احادیث، روایت اور تاریخ نقل کرتے ہیں، ان کے اقوال سے استناد کرتے ہیں؛ لیکن یہی لوگ اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام اوران کی اولاد کونظر میں نہیں لاتے۔ ان کے کتب خانوں میں شیعہ تفاسیر نہیں ملیں گی چونکہ ان میں 'قال الباقر' اور 'قال الصادق' لکھا ہوگا۔ یہ لوگ معاویہ کی صرف اس لئے تعریف کرتے ہیں کیونکہ وہ غالب ہوگیا، دربار والا تھا، درہم ودینار کے خزانے والا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں کرتے کیونکہ ان کا لباس پرانا اور بوسیدہ تھا، ان کا گھر بڑا سادہ اور معمولی تھا، انھوں نے اپنے مال کو تمام مسلمانوں اور اپنی اولاد کے درمیان بڑے عدل وانصاف سے تقسیم کیا، وہ متکبرین کے دشمن اور محرومین وکمزوروں کے دوست تھے، وہ ایک بے سرپرست عورت کے زیور چھن جانے پر ناراض ہوجاتے تھے، رنگین دسترخوان پر بیٹھنے والے اپنے گورنر کو عتاب سے بھرا ہوا خط لکھتے تھے، بیت المال سے زیادہ مال کا مطالبہ کرنے والے اپنے بھائی عقیل کو آگ میں دہکتا لوہا دکھاتے تھے اور جہنم کی آگ یاد دلاتے تھے۔

البتہ یہ عادتیں ایک انسان کے لئے مذموم ہیں۔ وہ کیونکہ اپنے آپ کو کمزور اور ناتوان پاتا ہے اوراس پھیلے ہوئے جہان میں اکیلا نہیں رہنا چاہتا اور دنیا کے مصائب ومشکلات میں کسی پناہ گاہ کی جستجو کرتا ہے، لہذا اسے عاقلانہ راستہ یہی دکھائی دیتا ہے کہ کسی کی پناہ اور کسی کے سایہ میں چلا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کی نگاہ میں طاقتور کی پناہ، کمزور کی پناہ سے بہتر ہے بلکہ ضعیف اور مستضعف سے تو دوری ہی رکھنا چاہئے۔ لیکن کمزور سے فرار اور طاقتوروں سے قربت اسی وقت تک نظر انداز کی جاسکتی ہے جب تک انسان ناتجربہ کار ہو، غیر مہذب اور بے تربیت ہو، اپنی خداداد شجاعت وہمت کو بھول چکا ہو، اپنی ذاتی شرافت وکرامت اور اعلی ظرفی کو باور نہ کر پایا ہو؛ لیکن جب وہ اس درجہ تک پہنچ جائے تو عدل کے زیر پرچم آجائے گا اور عدل وانصاف کا پیرو رہے گا؛ کمزوری یا طاقت جس طرح کے حالات سے دوچار ہو وہ انصاف کی راہ سے نہیں ہٹے گا۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ اگر یہ نسبت کلی ہو اور سارے اہل سنت کی طرف دی جائے تو اس کی حیثیت الزام تراشی اور تہمت زنی سے زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اہل سنت کے درمیان ہمیں ایسے بہت سے افراد نظر آتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ حضرت علی علیہ السلام کی طرف توجہ کرتے ہیں بلکہ آپ کو تمام اصحاب سے افضل واعلم مانتے ہیں اوران میں سے اکثر یزید کو ظالم اور امام حسین علیہ السلام کو ان کے انصار سمیت مظلوم مانتے ہیں، ظالم وجابر بنی امیہ اور بنی عباس اور خونخوار حجّاجیوں سے بیزار ہیں، شیعوں کے چار مشہور شہیدوں کے قاتلوں کی ستائش نہیں کرتے اوران سب

ظالموں کو سنی نہیں بلکہ سنی کے عنوان کا ناجائز فائدہ اٹھانے والا سمجھتے ہیں، امام صادق علیہ السلام کے فتوی کو امام ابوحنیفہ اور مالک کے برابر رکھتے ہیں اور کم سے کم مصر میں فقہ جعفری کی کرسی بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ حتی کچھ شیعہ کتب بھی وہاں چاپ ونشر ہوتی ہیں۔

اسی طرح شیعوں پر لگائے جانے والے الزامات بھی اس زمانے میں درست نہیں ہیں کیونکہ شیعہ علماء عظیم کتاب نہج البلاغہ کو اس کے تمام مندرجات کے ساتھ اور حضرت علی علیہ السلام کے خلفائے ثلاثہ سے نزدیکی روابط کے ساتھ معتبر ترین کتاب مانتے ہیں۔ اور اسے 'اخ القرآن' سمجھتے ہیں۔ لہٰذا کوئی روایت اگر نہج البلاغہ کے مخالف ہو تو وہاں نہج البلاغہ کو مقدم کرتے ہیں، اور اس کی شرح وتدریس کرتے تھے اور کرتے ہیں۔

شیعہ اور سنی کے درمیان ایسے لوگ حقیقی مسلمان، وفادار، آزاد اندیش، روشن فکر، دوراندیش، پرخلوص، بے ریا، شجاع اور صاف دل ہیں جنھوں نے بڑی دلاوری کے ساتھ اس زنجیر کو توڑ ڈالا ہے جو ان کے نادان والدین، استاد یا سماج نے ان کے پیروں میں ڈالی تھی۔ یہ لوگ کھلی فضا میں سوچتے ہیں اور اپنے آپ کو اندھی تقلید کے گرداب میں نہیں ڈالتے۔

ساتھ کھانا یا ساتھ رہنا ان لوگوں کو لاشعوری طور پر کسی خاص رخ پر نہیں موڑ سکتا۔ یہ لوگ چاہے شیعہ کے درمیان ہوں چاہے سنی کے درمیان انھیں مذہبوں کے درمیان اختلافات کے وقت یہ یاد رہتا ہے کہ اگر یہ لوگ بھی شروع ہی سے ان کے ساتھ رہن سہن رکھتے تو انھیں کی طرح سوچتے۔ اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر مذاہب کے اختلاف کی تحقیق کرتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ لوگ اپنی سوچ کو سماج اور ماحول سے باہر کر لیتے ہیں اور آزاد وصاف فضا میں سوچتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر اختلافات کو ہوا دینا اور یہ الزام تراشیاں اس قوم کے بزرگوں اور گزشتہ لوگوں میں تھیں تو اب تمام مسلمان ہوشیار اور بیدار ہو گئے ہیں اور اب نہ ان الزامات کو مانتے ہیں اور نہ ہی ان کی نسبت دیتے ہیں۔ اب سب سمجھ چکے ہیں کہ اگر ہم اپنے مشترک دشمن پر غالب ہونا چاہتے ہیں تو یہ حقیقی اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور انھیں بخوبی سمجھ میں آ گیا ہے کہ اگر زبان سے ایک دوسرے کو بھائی کہیں لیکن دل میں وہی نفرت اور دشمنی ہو اور الزام تراشیوں کا وہی بازار گرم ہو تو حقیقی اتحاد، پیدا نہیں ہو پائے گا اور دشمن پر کامیابی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔ مثلاً مکار دشمن کا ایک حربہ یہ ہے کہ جہاں شیعہ اور سنی دونوں آباد ہیں وہاں شروع میں وہ صرف ایک گروہ کو اجتماعی زندگی کا کوئی امتیاز دیتا ہے اور پھر الگ جا کر نظارہ کرتا ہے؛ اگر حقیقی اتحاد نہ ہو تو امتیاز پانے والے یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ یہ امتیاز ہمارے دوسرے بھائیوں کو کیوں نہیں دے رہے ہو پھر دوسرا گروہ یا تو خود ہی کھڑا ہو جائے

گا یا دشمن انھیں بھڑکائے گا اور پھر لڑوا دے گا۔

اس مقالہ میں ہمارے معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کے بیان کے مطابق مسلمانوں کو چاہئے کہ چودہ سو سال پہلے اپنے بزرگوں کے اختلافات کو بھی نہ کریدیں چہ جائیکہ وہ اختلافات جو بعد میں ان کے درمیان پیدا ہوئے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''تمھارے (گزشتہ) بزرگ مر چکے ہیں اور عادل اللہ کے یہاں ان کا فیصلہ ہوگا'' یعنی تم لوگ ان کے لئے جنت وجہنم کا فیصلہ نہ کرو۔ تم اپنے روزمرہ کے مسائل کو دیکھو، ان مسائل میں سر کھپانے سے تم کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ ہاں علم رجال اور تاریخ کے ماہرین کے لئے ان میں فائدہ ہوسکتا ہے کیونکہ وہ موثق ذرائع سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کی احادیث کو چاہیں گے جو کہ صرف فقہاء اور مفتیان دین کی ضرورت ہے؛ یا وہ حقائق کو باقی رکھنا چاہیں گے اور یہ بھی صرف محققین اور مورخین کی ضرورت ہے نہ کہ ساری امت کی، اور ضرورت بھی اعلیٰ سطح کے لئے ہے نہ کہ ہر سطح کے لئے؛ یعنی ان لوگوں کے لئے جو اپنی کوشش کو ایک یا دو صدی سے چودہ صدی تک پہنچا دیں۔ ان دو گروہوں کے علاوہ باقی مسلمانوں کو چاہئے کہ دیگر مذاہب کے عقائد کے مقابل میں سکوت اختیار کریں، مسئلہ کو نازک نہ بنائیں۔ اور ہر مسلمان یہ باور کرے کہ دیگر مسلمان بھی اس کی طرح انسان ہیں اور اس کی طرح وہ بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کی طرح وہ بھی مذہب کے انتخاب میں آزاد ہیں اور جس طرح وہ اپنے مذہب کو قطعی اور ناقابل انکار دلائل کے ذریعہ برحق سمجھتا ہے دوسرے بھی اسی طرح دلائل کے سبب اپنے مذہب کو برحق سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ طرفین کے ممتاز علماء اس بات کا دعوی کرتے ہیں۔ اور طویل مناظروں کے بعد کہتے ہیں کہ'' **انا او ایاکم لعلی هدی او ضلال** : ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہدایت پر اور دوسرا گمراہی پر ہے''۔ جیسے سید شرف الدین اور شیخ سلیم مصری کا مباحثہ ہے۔ بالآخر خلافت اور امامت کے اختلاف اور دوسرے علمی اختلافات میں کیا فرق ہے؟!!!

هدانا الله و جميع المسلمين الى الصراط المستقيم

اسلامی اتحاد کی دینی تفسیر

اسلامی اتحاد کی دینی تفسیر سے مراد وہ تفسیر ہے جسے مختلف اسلامی مذاہب کے علماء نے پیش کیا ہے۔ اس تفسیر کا عملی طور پر کم نتیجہ ہونے کا زیادہ تر سبب یہ ہے کہ دین کے علماء اس کی وہ تفسیر کرتے ہیں جو دین کے بارے میں ان کی سمجھ کے مطابق ہے اور اس کے علاوہ کوئی تفسیر ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس طرح اتحاد کا یا تو موضوع ہی

وجود میں نہیں آتا یا پھر وہ ایک تکلّفاتی اور ظاہری بات بن کے رہ جاتی ہے۔البتہ ہمیشہ تاریخ میں ایسے علماء نظر آتے ہیں جو حقیقتا اتحاد کی دینی تفسیر کرتے ہیں اور مختلف مذاہب اور مختلف نظریات کے ایک ساتھ ہونے کو نہ صرف یہ کہ تمام مذاہب کے اعتقادات کے منافی نہیں جانتے بلکہ وہ کثرت میں اتحاد کا عکس دیکھتے ہیں۔مثلا آیۃ اللہ بروجردی جنھوں نے اس وقت حوزہ میں ایک خاص قسم کی فضا قائم ہونے کے باوجود شجاعت کے ساتھ تقریب بین المذاہب کی بات رکھی اور دارالتقریب کی حمایت کی۔وہ اتحاد کی اس تفسیر کے قائل تھے۔شہید مطہریؒ بھی اسی زاویہ سے اتحاد کو دیکھتے تھے، آپ نہ صرف یہ کہ مذاہب کے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے قائل نہیں تھے بلکہ اتحاد کی ایسی تفسیر کے بھی قائل نہیں تھے جو تمام مذاہب کے مشترکات کو لیکر اور ان کے افتراقات کو چھوڑ کر ایک نئے مذہب کی ایجاد کا پیش خیمہ بن جائے۔آپ اتحاد کو مذاہب کے پیروکاروں کے اتحاد میں دیکھتے تھے؛ جو تمام اعتقادی، فقہی، کلامی اور مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ توحید، نبوت اور قیامت کی طرح دوسرے مشترک مسائل کے ہمراہ ہو اور مشترک دشمن کے سامنے متحد ہو کر کھڑے ہونے کا پیغام دے۔آپ حتی اصول یا فروع میں بحث اور مباحثہ کو اتحاد کے منافی نہیں سمجھتے تھے۔لیکن ہاں شیعہ سنی دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جھوٹ، الزام تراشی، ایک دوسرے کے استدلال کا مذاق اڑانے، ایک دوسرے کے جذبات کو مجروح کرنے اور منطق و استدلال کی قلمرو سے باہر جانے سے پرہیز کے علاوہ گفتگو میں متانت و سنجیدگی کی سفارش کرتے تھے۔

لہٰذا اس طرح کے چھوٹے موٹے موارد اگرچہ اتحاد کے راہ میں حائل نہیں ہو سکتے لیکن؛ اولا: جیسا کہ کہا گیا اکثر علمائے دینی اتحاد کی ایک ایسی تصویر کھینچتے ہیں جو نقض غرض کا باعث بنتی ہے اور اتحاد ہی کی راہ روک لیتی ہے۔ثانیا: مذہبی عصبیت میں بیجا شدت، گروہ بندی، عوام پسندی، علماء کا ایسے اصلاحی فتاوی سے پرہیز جو عوام کے جذبات اور رسم و رواج سے ٹکراتا ہو یہ سب مل کر شجاع علماء کی تاثیر کلام کو کم کر دیتے ہیں، اور امکان کے باوجود منزل تک پہنچنے میں دشواریاں پیدا کر دیتے ہیں۔

گزشتہ مندرجات کی بنیاد پر ہم نے صدر اسلام میں 'اختلافات کے تفرقہ میں تبدیل ہونے' کی وجہ سیاست بازی کو مانا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے اقدامات کو دینی اتحاد قرات کا عنوان دیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ آپ نے کس طرح عاقلانہ اور صابرانہ طریقہ سے کوشش کی کہ اختلافات کسی طرح تفرقہ کا سبب نہ بنیں۔

دنیا کی واحد شیعہ حکومت جو اپنے آپ پر احکام دینی کے نفاذ کو فرض سمجھتی ہے اور اس پر افتخار کرتی ہے اسے نہ صرف یہ کہ داخلی طور پر برادران اہلسنت کے ساتھ رہن سہن میں کوئی دشواری نہیں ہے بلکہ عالم اسلام کے ساتھ اپنے وسیع اور گہرے تعلقات قائم کرنے کے لئے اس نے اپنے تمام ذرائع کو استعمال کیا ہے۔

وہ برادران شیعہ جو کسی تعصب کی بنیاد پر اتحاد کو اسلام کی حفاظت کے لئے ضروری نہیں سمجھتے ان سے صراحت اور یقین کے ساتھ عرض ہے کہ 'دینی اور اسلامی اتحاد' کو قبول کرنے اور ماننے میں اقلیت میں رہنے والے شیعوں کی سربلندی وسرفرازی مضمر ہے۔

مہد تشیع اور واحد شیعہ حکومت ہونے کے اعتبار سے ایران اس وقت کامیاب وسربلند ہوسکتا ہے جب وہ عملا ثابت کرے کہ اسلامی اقوام وامما لک میں پائی جانے والی عظیم قوت اور اسلام کی شان شوکت صرف 'اسلامی اتحاد' کے زیر سایہ ہی حاصل ہوسکتی ہے۔اور یہ کہ وہ اس اہم مقصد کے حصول کے لئے داخل ایران کے برادران اہل سنت کے حقوق کی حفاظت اور دیگر مسلمانان عالم سے مستحکم روابط قائم کرنے کے لئے کسی اقدام سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔

ایک شیعہ حکومت کی ایسی تصویر یقیناً ایران کے اہل سنت اور دنیا کے شیعہ سنی دونوں کو اپنا گرویدہ بنا دے گی۔

ایران کی قوم وحکومت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا عزت ہوسکتی ہے کہ اسلامی اتحاد کی راہ میں اس کے بلند اور استوار قدم کو دیکھ کر دنیا واسلام اس کی طاقت وقدرت پر فخر کرے۔

اتحاد کے علمبردار

علامہ حلی یوسف بن مطہر (آفتاب حلہ)

رحیم ابوالحسنی ۞
ترجمہ: سید شاہد حسین رضوی

مقدمہ

شہر حلہ جس نے عظیم اور جانی مانی شخصیتوں جیسے ''ابن ادریس حلی'' (متوفائے ۵۹۸ھ) اور محقق حلی'' (متوفائے ۶۷۲ھ) کو پروان چڑھایا تھا، وہ اس بار عالم اسلام کے چمکتے ہوئے علمی چہرہ کا استقبال کر رہا ہے، ایسی شخصیت جو قومی اور مذہبی تعصب کی عینک اتار کر مسلمانوں کے چہرہ پر آفتاب کی مانند چمکی اور جس نے جملہ اسلامی مذاہب کو اپنا ممنون قرار دیا، یہ جگمگاتی شخصیت علامہ حلی ہیں جن کی پر افتخار زندگی کے چند پہلوؤں کا تذکرہ اس مقالہ میں کیا جا رہا ہے۔

خاندان علامہ

آل مطہر کے خاندان کی اصلیت عرب کے قبیلہ بنی اسد سے ہے جن کی تعداد حلہ میں دوسرے قبیلوں سے زیادہ ہے اور یہ خاندان ریاست وسرداری کا حامل ہے۔ اس قبیلہ سے بہت بڑے بڑے لوگ نمایاں ہوئے جو علمی اور سیاسی میدان میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئے۔ حلہ، شہر ہونے سے پہلے ''جامعین'' نامی ایک محلّہ تھا جو نسل مزیدیان کے چھوتھے حاکم ''سیف الدولہ صدقہ بن منصور مزیدی'' [۱] (متوفائے ۵۰۱ھ کے حکم سے ۴۹۵ھ میں شہر بنا۔ (ساعدی، ۱۳۶۶ھ ش، ج ۱/ص ۴۰۹) اسی وجہ سے کبھی کبھی شہر حلہ کو ''حلیہ سیفیہ'' یا ''حلہ مزیدیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

۞۔ مدرس حوزہ علمیہ، صاحب قلم اور محقق

۱۔ یہ شخص ''سیف الدولہ حمدانی'' کے علاوہ ہے جو حلب اور شام کا حاکم تھا اور ۳۵۷ھ میں وفات پائی

علامہ حلی کے اباء واجداد کے بارے میں دقیق معلومات نہیں ہیں، آپ کے دادا ''زین الدین'' حلہ کے بزرگوں میں سے تھے اوران کی سوانح حیات کتابوں میں بہت کم دیکھنے کوملتی ہے لیکن آپ کے والد ''سدیدالدین یوسف بن علی'' (وفات ۶۶۵ھ) حلہ کے بزرگ علماء میں تھے، علامہ حلی کی علمی تربیت میں ان کا اہم کردار رہا ہے علامہ نے اپنے والد کے بعض فقہی اقوال اور فتوؤں کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے جو ان کے والد کے فقہی اور کلامی موضوعات میں صاحب نظر ہونے کی دلیل ہے یہاں تک کہ علامہ کی لکھی ہوئی بعض کتابیں ان کے والد کے ہی نوٹ ہیں جیسے ''کتاب الفین''

ان کے والد کی عظمت و بزرگی کے لئے یہی کافی ہے کہ ''نجم الدین محقق حلی'' (وفات ۶۷۲ھ) سے منقول ہے کہ انھوں نے علامہ حلی کے والد اور مفید الدین بن جہم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ دونوں (سدید الدین اور مفید الدین) علم کلام اور اصول فقہ میں سب سے اعلم ہیں'' (مقدمہ کتاب مختلف الشیعہ)

اسی طرح آپ کے والد کا شجاعت اور تدبیر میں بھی بول بالا تھا، جب کہ ہلاکو خان جس نے بغداد کو اپنے قبضہ میں کرلیا تھا تو انھوں نے دوسرے دو عالموں کی ہمراہی میں اسے کربلا اور نجف پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ (حاج سید جوادی و دیگران، ۱۳۸۴ھ ش، ج ۱۱، ص ۳۵۶)

آپ کی والدہ بھی ایک اصیل عرب کے قبیلہ بنی سعید کے ایک خاندان کی باعفت خاتون تھیں جو صاحب شرائع محقق حلی کی بہن اور صاحب کتاب الجامع ''یحی ابن سعید حلی'' (وفات ۶۹۰ھ) کی پھوپھی تھیں، اس خاندان کو علمی میدان میں حاصل ہونے والا افتخار آپ کی ماں کی برتری اور فضیلت کا سبب بھی بنا ہے۔

آپ کے بھائی ''رضی الدین علی بن سدیدالدین یوسف'' ان علماء وفقہاء میں سے تھے جو باہم علامہ کے پدر بزرگوار اور محقق حلی کے درس میں شرکت کرتے تھے رضی الدین علامہ سے تیرہ سال بڑے تھے۔ ان کی کتاب ''العدد القویہ'' ہے جو معتبر کتابوں میں سے ہے اور کتاب ''بحار الانوار'' کے مصادر میں سے ہے۔

علامہ حلی کی بہن ''مجد الدین ابوالفوارس'' کی بیوی تھیں جن کے دو فرزند ''عمید الدین اعرجی'' (وفات ۷۵۴ھ) اور ''ضیاء الدین اعرجی'' (وفات ۷۴۰ھ) علامہ کے شاگرد تھے۔

علامہ کے بیٹے ''ابوطالب محمد بن حسن حلی'' (وفات ۷۷۱ھ) معروف بہ فخر المحققین بزرگ علماء میں سے تھے، جو فقہ، تفسیر، کلام، فلسفہ، حدیث اور اصول وغیرہ کے استاد تھے اور ان کی کتاب ''ایضاح الفوائد فی شرح القواعد'' شیعوں کی اہم فقہی کتابوں میں سے ہے۔

علامہ کے ماموں ''ابوالقاسم نجم الدین جعفر بن سعید حلی'' (وفات ۶۷۶ھ) کا شمار شیعوں کے مشہور ترین

فقہا میں ہوتا ہے، ان کی متعدد تالیفات ہیں جن میں سے سب سے اہم ''شرائع الاسلام'' ہے، محقق حلی کا علامہ کو فقہی اور اصولی مبانی کی تعلیم دینے میں بنیادی کردار رہا ہے۔

حلہ کا جغرافیہ

حلہ عراق میں بغداد سے ۹۳ کلومیٹر کے فاصلہ پر نجف اور کربلا کے درمیان واقع ایک شیعہ نشین شہر ہے جس کے بیچ سے دریائے فرات گزرتا ہے۔ اس کے شمال میں قدیم شہر بابل کا ویرانہ دکھائی دیتا ہے، حلہ کے معنی لغت میں لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ اور منزل گاہ ہے۔ اس نام کو شیعوں نے رکھا ہے اس سے پہلے ''جامعین'' کہا جاتا تھا۔ اس شہر کے سیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام زمانہؑ حلہ کی مسجد میں داخل ہوئے پھر واپس نہیں نکلے، مراکش کا سیاح ''ابن بطوطہ'' (وفات ۷۷۹ھ) اپنے سفر نامہ میں اس شہر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''اس شہر کے رہنے والے سبھی شیعہ اثنا عشری ہیں۔ اس شہر کے بڑے بازار کے نزدیک ایک مسجد ہے جس کے در پر حریر کا پردہ لگا ہوا ہے اسے مسجد صاحب الزمان کہتے ہیں، حلہ کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت امام زمانہؑ جن کا نام محمد بن امام حسن عسکری ہے اس میں داخل ہوئے اور وہیں سے غیبت کے پردے میں چلے گئے اور عنقریب وہاں سے ظہور کریں گے یہ لوگ انھیں امام منتظر کہتے ہیں'' (گزشتہ حوالہ، ج/۶، ص/۵۰۶)

حمد اللہ مستوفی نے بھی لکھا ہے کہ حلہ کے سبھی لوگ شیعہ اثنا عشری مذہب کی طرف مائل ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ امام منتظرؑ المھدی بن الحسن العسکریؑ جو ۲۶۴ھ میں سامرا سے غائب ہوئے ہیں اسی شہر سے ظہور فرمائیں گے۔ (گزشتہ حوالہ)

اسی طرح کی دوسری روایات بھی ہیں جسے علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد نمبر ۱۴ باب ''الممدوح و المذموم من البلدان'' میں شہید اول سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''میں نے جمال الدین علامہ حلی کی تحریر دیکھی ہے جس مین وہ اپنے والد کے حوالے سے ابوالمکارم سید بن زہرہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب وہ حج کے لئے جاتے ہوئے حلہ شہر میں داخل ہوئے تو وہ (ابوالمکارم) بہت ہی خوش تھے، جب سبب پوچھا گیا تو کہا: مجھے خبر ہے کہ تمھارا شہر حلہ کن فضیلتوں کا حامل ہے، لوگوں نے پوچھا وہ فضیلتیں کیا ہیں؟

فرمایا: میرے والد نے دادا سے اور انھوں نے جعفر بن قولویہ سے انھوں نے شیخ کلینی سے نقل کیا ہے کہ: علی ابن ابراہیم قمی نے اپنے والد سے، انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے محمد بن ابی عمیر سے، انھوں نے ابوحمزہ ثمالی سے اور انھوں نے اصبغ بن نباتہ سے نقل کیا ہے کہ اصبغ نے کہا: جنگ صفین جاتے وقت میں امیر المومنین علیہ

السلام کے ساتھ تھا حضرتؑ نے راستہ میں ایک بڑے ٹیلے پر گھڑے ہوکر، بابل اور ٹیلے کے درمیان کے جنگل کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''یہاں ایک شہر ہے اور کیسا (اچھا) شہر! میں نے عرض کیا کہ: کیا یہاں کوئی شہر تھا جس کے آثار فی الوقت نہیں ہیں؟

فرمایا: نہیں یہاں ایک شہر بنے گا جسے حلہ سیفیہ کہیں گے جس کی بنیاد قبیلہ بنی اسد کا ایک شخص رکھے گا اس شہر سے پاک و پاکیزہ افراد ظہور کریں گے جو خداوند عالم کی بارگاہ میں مقرب اور جن کی دعائیں قبول ہوں گی'' (خوانساری، بی تا، ج ۲/ص ۱۷۰/، بہ نقل از دوانی، ۱۳۷۸ھ ش، ج ۴/ص ۲۴۴/)

اگر مذکورہ روایت صحیح ہے تو حقیقت میں بھی وہی نظر آرہا ہے، اس لئے کہ اس شہر سے ایسی پاک و پاکیزہ شخصیتیں نکلی ہیں جو سب کے سب خیر و برکت کا سرچشمہ تھیں جنھوں نے علم کی دنیا میں گراں قدر آثار چھوڑے ہیں۔ نکتہ کی بات تو یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ اس شہر سے پوری طرح شیعیت کی بو آتی ہے لیکن پھر بھی اس شہر کے علماء و فقہا جیسے سید بن طاؤس، محقق اول، ابن معیہ، ابن نما، ابن ادریس، ابن داؤد اور خاص کر علامہ حلی کے علمائے اہل سنت سے گہرے تعلقات رہے ہیں اور ان کے درمیان آپس میں استاد اور شاگرد کے تعلقات قائم تھے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے کہ علامہ حلی کے بہت سے اہل سنت شاگرد تھے یہاں تک کہ بعض اہل سنت اپنے شرعی مسائل علامہ سے ہی دریافت کرتے تھے۔

علامہ حلی کی پیدائش اور پرورش

ابومنصور جمال الدین حسن بن یوسف بن مطہر حلی معروف بہ ''علامہ'' شہر حلہ میں شب جمعہ ۲۷ رمضان المبارک ۶۴۸ھ کو دنیا میں تشریف لائے۔ (خوانساری، ج ۱/ص ۳۶۶/) بعض اطلاعات کے مطابق ۲۹ رمضان المبارک کو پیدا ہوئے اور یہی مطالب خود علامہ نے ''سید مہنا مدنی'' کے سوالات کے جواب میں اپنے والد سے نقل کیا ہے۔ (گزشتہ حوالہ)

وہ علمی و سماجی اعتبار سے ایک جانے مانے خاندان میں پیدا ہوئے اسی لئے تعلیم کے تمام وسیلے ان کے لئے فراہم تھے اور چوں کے خود ہی نہایت ذہین تھے لہٰذا بہت ہی جلدی علم کے مراحل طے کئے انھوں نے بچپن سے ہی حلہ میں تعلیم شروع کردی تھی۔ قرآن مجید کی تعلیم اور لکھنا اپنے مخصوص استاد ''محرم'' جسے ان کے والد نے معین کیا تھا سے سیکھا اس کے بعد عربی، فقہ، اصول، حدیث، کلام اور قواعد اپنے والد ''سدید الدین'' اور ماموں ''محقق حلی'' سے حاصل کئے۔ اپنی تعلیم کے دوران ہی علوم عقلی ''شمس الدین محمد کتبی'' کی شاگردی میں حاصل کیا درس کے

دوران کبھی کبھی اپنے استاد پر ایسے اشکالات کرتے تھے کہ وہ جواب نہ دے سکتے اوران کی ذہنیت پر حیرت کرتے تھے۔

علم منطق مشہور منطقی ''شیخ نجم الدین علی بن عمر کاتبی قزوینی معروف بہ ''دبیران'' سے حاصل کیا اور علم حکمت اور ہیئت کو استاد کل ''خواجہ نصیر الدین طوسی'' (وفات ۶۷۲ھ) سے مکمل کیا، اسی طرح علامہ حلی نے ''شیخ برہان الدین نسفی'' کی بعض کتابیں خود ان ہی سے پڑھی ہیں اور یہی وہ استاد ہیں جن کی علامہ نے زاہد اور انصاف پسند جیسے صفات سے توصیف کی ہے۔ علامہ ابھی سن بلوغ تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ مذکورہ تمام علوم حاصل کر کے فارغ ہو گئے اور اجتہاد کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ گئے تھے۔ (دوانی، گزشتہ حوالہ، ص/۲۴۶)

عراق کے خراب حالات اور علامہ کا کردار

علامہ نے اپنی جوانی حلہ میں گزاری اسی زمانے میں ایران چنگیز خان مغل کے ظلم وستم کی آگ میں جل رہا تھا اور ملک کے اہم شہر برباد ہو چکے تھے اور بے گناہ لوگ چھوٹے چھوٹے بہانوں سے آخری نفر تک قتل عام ہو رہے تھے، کچھ ہی دنوں بعد ''ہلاکو خان'' نے عراق پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور ۶۵۶ھ میں بغداد پہنچ گیا اور وہاں نا امنی پھیلا دی، اس وقت علامہ کی عمر آٹھ سال تھی اور وہ اپنے والد کے ساتھ حلہ میں رہتے تھے سبھی شہری باشندوں نے بھاگ بھاگ کر اطراف کے دیہاتوں میں پناہ لی اسی دوران شہر نجف وکربلا بھی خطرہ کے نشانہ پر تھا کہ علامہ کے والد سدید الدین حلی دوسرے دو علماء کے ہمراہ ان سخت حالات میں ہلاکو خان سے ملنے گئے اور اس سے ایک حکم نامہ لیا کہ یہ مقدس مقامات مغلوں کے قتل و غارت سے امان میں رہیں۔ (گزشتہ حوالہ، ص/۲۴۷)۔ ہلاکو خان کی شہنشاہیت کی ہیبت کے پیش نظر اس ملاقات میں کامیابی تاریخ میں مشہور رہے جو علامہ کے والد کے عراقی سماج میں بلند مرتبہ کی نشانی ہے۔ اس واقعہ سے متعلق مزید معلومات کے لئے کتاب مجالس المومنین کی طرف رجوع کیا جائے۔ (شوشتری، ۱۳۷۷ھ ش، ج/۲ص/۳۵۱)

تمام اسلامی فرقوں سے علامہ کے علمی تعلقات

بغداد پر قبضہ اور عراق کی شکست کے بعد ۶۵۶ھ میں علامہ کی جوانی کا دور ختم ہوا اور علمائے اسلام سے ملاقات اور ان کی معلومات سے استفادہ کی غرض سے علامہ نے حلہ سے باہر نکل کر عراق کے دیگر شہروں منجملہ بغداد کا سفر کیا۔ یہ امر اس وقت پیش آیا جب خواجہ نصیر الدین طوسی اپنی زندگی کے آخری ایام میں ''اباخان بن ہلاکو خان'' کے ہمراہ عراق آئے تھے اور ائمہ اطہار کی زیارت کو جاتے ہوئے شہر حلہ میں داخل ہوئے، علامہ نے موقع سے فائدہ

اٹھایا اور خواجہ کی شخصیت اور علم کا اہتمام واحترام کیا اور خواجہ کے آخری دم تک سفر اور حضر میں انھیں کے ساتھ ساتھ تھے۔(دوانی، گزشتہ حوالہ)

علامہ کے حلہ سے باہر نکلنے کے ساتھ ہی اپنے ہم عصر شیعہ وسنی علماء سے استفادہ کی زمین ہموار ہوگئی اور اس دوران آپ فقہ مذاہب اربعہ سے بہرہ مند ہوئے۔اس طرح کہ بہت سے سنی فضلاء آپ سے درس پڑھ کر آپ کے شاگردوں کی فہرست میں آگئے، اہل سنت کی فقہ سے متعلق علامہ کا مطالعہ سبب بنا کہ بعض شیعہ علما نے ان پر سنی ہونے کا الزام لگایا۔[1] علامہ کے اساتذہ اور شاگردوں کے تعارف کے دوران ہم علامہ کے سنی اساتذہ وشاگروں کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

بہر حال اہل سنت علماء کے ساتھ علامہ کے علمی تعلقات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور انھوں نے ان کے ساتھ متعدد مناظرہ بھی کئے ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور اتفاق سے (سلطان محمد خدا بندہ) معروف بہ (اولجا بتو) کے شیعہ ہونے کا ماجرا انھیں مناظرات کی وجہ سے پیش آیا۔حقیقت میں علامہ کی مسلمانوں کے دلوں میں محبوبیت اور کامیابی کا راز سنی علماء میں گھل مل جانا اور سامنے والے کا احترام کرنا ہے۔علی دوانی مرحوم اسلامی مذاہب کے علماء کو ایک دوسرے کے مکاتب اور مبانی سے تعلقات قائم کرنے کی طرف تشویق کے ضمن میں گلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہمارے بزرگ علماء کی ابتدائی صدی سے اس بات کی طرف توجہ تھی کہ وہ علم فقہ، اصول، حدیث، تاریخ، شعر، ادب، فلسفہ، کلام، اور منطق وغیرہ میں علمائے اہل سنت کے علوم اور ان کی راہ وروش سے استفادہ کرتے تھے۔ تا کہ اس طرح زیادہ اساتذہ سے استفادہ کرنے کے علاوہ خود کو محدود بھی نہ کریں تدریس اور تالیف کے وقت وسیع اور جامع الاطراف نقطۂ نظر اور دور اندیشی کے ساتھ عمل کریں شاید شیعی فقہ اصول اور حدیث کی اہل سنت پر برتری کے اسباب میں سے ایک سبب یہی ہے۔ ہر چند علمائے اہل سنت بھی کم وبیش شیعہ علماء سے استفادہ کرتے تھے، اے کاش یہی طریقہ جاری رہتا اور اہل سنت بھی ہماری طرح اہل بیت عصمت وطہارت کی غنی فقہ وحدیث سے آگاہ ہوتے اور یہ نوبت نہ آتی کہ چودہ صدیوں کے بعد اعتراف کرتے کہ ان کے اجتہاد ونظریات کی حد وسیع ہونی

۱۔مثال کے طور پر اس بحث میں کہ کیا خبر واحد قرینہ کے ساتھ حجت ہے یا قرینہ کے بغیر بھی حجت ہے علامہ کا عقیدہ ہے کہ قرینہ کے بغیر بھی حجت ہے اور کتاب عدہ الاصول میں شیخ طوسی کے نظریہ کو اسی معنی پر حمل کرتے ہیں جو کہ اہل سنت کے نظریہ سے ہم آہنگ ہے اور اسی وجہ سے بعض شیعہ علماء نے علامہ پر غفلت اور اہل سنت کے مبانی سے مانوس ہونے کی تہمت لگائی ہے۔(نمونے کے طور پر دیکھئے، شیخ انصاری، فرائد الاصول، ج ۱ص ۳۲۲۔۱۴۲۲ھ)

چاہئے اور یہ بھی اعتراف نہ کرتے کہ صرف چار قدیم فقہاء ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور حنبل کی فقہ پر تکیہ کرنا اچھا کام نہیں تھا اور اب ترک کرنا چاہئے'' (دوانی، گزشتہ حوالہ، ص/۲۵۵ حاشیہ)

مزے کی بات تو یہ ہے کہ علمائے اہل سنت کے ساتھ علامہ کی مناظرے اور علمی بحثیں مسالمت آمیز اور ہر طرح کے تعصب سے دور ہوتی تھیں اور بہت سے سنی علماء ان مناظروں کے بعد علامہ کے علمی رتبہ سے آگاہ ہوتے تھے۔ شوشتری لکھتے ہیں:

شیخ جمال الدین بن مطہر اور مولانا عبدالملک نظام الدین کے درمیان بہت سے مناظرے ہوئے مولانا نظام الدین نے ان کا نہایت درجہ احترام کیا اور ان کی تعظیم میں مبالغہ کی حد تک پہنچ گئے یہ بحثیں افادہ واستفادہ کی بنیاد پر تھیں نہ کہ جنگ وجدل اور دشمنی کی بنیاد پر اور شیخ جمال الدین ہرگز تعصب سے بحث نہیں کرتے تھے صحابہ کے احترام اور تعظیم میں مبالغہ کرتے تھے اور اگر کوئی صحابہ کو برا کہتا تو منع کرتے تھے'' (شوشتری، گزشتہ حوالہ، ص/۳۶۰)

حافظ ابروی شافعی ''نظام الدین عبدالملک شافعی'' کے ساتھ علامہ کے منظروں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ بحث میں کسی طرح بھی تعصب سے کام نہیں لیتے تھے۔۔۔ وہ علم کا دریا تھے، خواجہ نصیر کے شاگردوں میں سے تھے، علم معقول ومنقول میں مشہور اور یگانۂ عالم تھے۔ جب سلطان کے پاس آئے تو کتاب کشف الحق، نہج الصدق اور منہاج الکرامہ میں باب الامامۃ [1] کو تحفہ کے طور پر لے کر آئے، عبدالملک نظام الدین کے ساتھ علامہ کے مناظرے افادہ واستفادہ کے طور پر ہوئے تھے نہ کہ جنگ وجدل ضد اور دشمنی کے طور پر۔ یہاں تک کہ کسی بھی صورت میں تعصب سے کام نہیں لیتے تھے اور مشہور صحابہ کی توہین نہیں کرتے تھے، اگر کوئی شخص صحابہ سے متعلق برے الفاظ زبان پر لاتا تھا تو وہ منع کر دیتے تھے'' (بہ نقل از صدر الحاج سید جوادی ودیگران، ج/۱۱، ص/۳۵۶)

جن علماء سے علامہ نے مناظرہ کیا ہے سارے اہل سنت کے بزرگ عالم شمار ہوتے ہیں، منجملہ ''قاضی ناصر الدین بیضاوی، صاحب تفسیر انوار التنزیل'' ''قاضی عضد الدین ایجی'' صاحب کتاب مواقف، ''محمد بن محمود آملی'' صاحب کتاب نفائس الفنون، نظام الدین عبدالملک مراغی'' شافعی مذہب کے بذرگ علماء میں سے ہیں اور''

۱۔ ان دو کتابوں کا جواب سنی علماء کی طرف سے لکھا گیا ہے، فضل بن روز بہان نے کتاب ''الابطال الباطل'' لکھ کر علامہ کی کتاب ''کشف الحق'' کا جواب دیا اور بعد میں قاضی شوشتری مرحوم نے کتاب ''احقاق الحق'' کو ''ابطال الباطل'' کے جواب میں لکھا۔ اسی طرح احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ حرانی نے کتاب ''منہاج السنۃ'' لکھ کر علامہ کی کتاب ''منہاج الکرامۃ'' کا جواب دیا۔

قاضی القضات سلطان محمد خدابندہ''، ملا بدرالدین شوشتری''، ''ملا عزالدین ایجی''، ''سید برہان الدین عمیری'' اور دوسرے حضرات۔(دوانی، گزشتہ حوالہ، ص/۲۴۸)

علامہ اور ابن تیمہ

جب علامہ نے کتاب ''منہاج الکرامۃ فی اثبات الامامۃ'' تالیف کر کے سلطان محمد خدابندہ (اولجایتو) کو تحفہ کے طور پر دی تو (ابن تیمیہ حرانی حنبلی'' (مقتول ۷۲۸ھ) نے غصہ میں آ کر کتاب (منہاج السنۃ) اس کے جواب میں لکھی اور اسی کتاب نے متعصب فرقہ وہابیت کی تشکیل کے لئے زمین ہموار کی، ابن تیمیہ نے اس جوابی کتاب میں علامہ کی تحریر پر نہایت جسارت کے ساتھ اشکال کیا، ابن حجر کتاب لسان المیز ان میں علامہ کی نیک صفت اور فضیلت بیان کرنے اور انھیں شیعوں کا رہبر جتانے کے بعد لکھتے ہیں:

''ابن تیمیہ نے ان کی بعض کتابوں کا جواب دیا ہے، میں نے ان میں سے ایک کتاب دیکھی ہے جس میں ابن تیمیہ نے ان کا جواب دینے میں اپنی خواہش پوری کی ہے اور بہت سی صحیح اور معتبر روایتیں جو علامہ نے نقل کی ہیں مردود قرار دی ہیں، ابن تیمیہ نے علامہ کی برائی کرنے میں اس حد تک مبالغہ کیا ہے کہ کبھی کبھی امام علی (رضی اللہ عنہ) کی شان میں بھی گستاخی کر کے ان کے مرتبہ کو کم کر کے دکھایا۔(ابن حجر، ج/۶ ص/۳۱۹)

بہر حال جس وقت سے علامہ کی کتاب منہاج الکرامۃ ابن تیمیہ کے ہاتھ لگی ہے اور اس میں امیر المومنین علیہ السلام اور ان کی معصوم اولاد کی امامت سے متعلق علامہ کے متین استدلال کا مشاہدہ کیا اور دوسری طرف یہ کتاب شیعہ وسنی دونوں کی توجہ کا مرکز قرار پائی اسی وقت سے اس نے اس کے جواب میں کتاب منہاج السنۃ لکھی اور اس میں ادب واحترام کی حد پار کر گیا یہاں تک کہ علامہ کو نازیبا کلمات سے یاد کیا (ابن مطہر کے بجائے ابن منجس لکھا) اور اپنے خیال میں اپنی اس جسارت کے ذریعہ علامہ کا جواب دے دیا! اور یہ بھول گیا کہ بقول سعدی'' جاہلوں کی عادت ہے کہ اگر سامنے والے کی دلیل کے مقابلہ میں پست ہو جاتے ہیں تو دشمنی اور جنگ کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں جس طرح بت تراش آذر کے پاس جب بھتیجے ابراہیمؑ کی دلیل کا کوئی جواب نہ ملا تو ان کے ساتھ جنگ پر اتر آیا کہ'' **لئن لم تنته لا رجمنک**''

ابن تیمیہ نے اس حد تک افراط سے کام لیا کہ اہل سنت کے متعصب علماء نے بھی اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا، اس لئے کہ اس نے اس کتاب میں علامہ کے جواب کے عنوان سے اہل بیتؑ کے فضائل ومناقب میں موجود بہت سی روایتوں سے جو کہ اہل سنت کی معتبر اور صحیح کتابوں میں بھری پڑی ہیں، انکار کر دیا اور اپنے مذہب کے لوگوں

کی سیرت کے برخلاف سب کو باطل قرار دے دیا، جب ابن تیمیہ کے کسی جواب کو علامہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو فرمایا: ''اگر ابن تیمیہ یہ سمجھا ہوتا کہ میں نے کیا لکھا ہے تو میں اس کا جواب دیتا (لسان المیزان، ج ۲/ص ۳۱۷، بہ نقل از دوانی، ج ۴/ص ۲۵۳)

'' قاضی نور اللہ شوشتری'' (شہید ۱۰۱۹ھ نور الدین مصری کی کتاب ''تذکرہ'' سے نقل کرتے ہوئے کتاب ''مجالس المومنین'' میں لکھتے ہیں: ابن تیمیہ چھپ چھپ کر علامہ کی برائی کرتا تھا جب علامہ کو اس کی خبر ملی تو یہ دو شعر اس کے لئے لکھے:

'' لو کنت تعلم کل ما علم الوری . طرا لصرت صدیق کل العالم ''

'' لکن جهلت فقلت ان جمیع من یهوی خلاف هواک لیس بعالم ''

یعنی اگر جو کچھ سارے لوگ جانتے ہیں تو بھی جانتا تو علماء کو دوست رکھتا لیکن تو نے جہالت و نادانی کو اختیار کیا ہے لہٰذا تو نے کہا ہے کہ جو بھی میری خواہش نفس کے خلاف ہے وہ عالم نہیں ہے۔ شوشتری یاد دہانی کراتے ہیں کہ علامہ نے اس کی گستاخیوں کے جواب میں صرف یہی دو شعر لکھے (شوشتری، ج ۱/ص ۵۷۳، ۱۳۷۷ھ ش بہ نقل از دوانی، ج ۴/ص ۲۷۸)

سلطان محمد خدابندہ (اولجایتو) کا شیعہ ہونا

(اولجایتو) شیعہ ہونے سے پہلے حنفی مذہب کی طرف مائل تھا لیکن کبھی بھی اس مذہب میں متعصب نہیں تھا اس وجہ سے اس کے حوالی موالی دوسرے مذہب کی پیروی کرتے تھے یہاں تک کہ اس کے بعض نوکر حنفی مذہب کے علاوہ دوسرے مذہب کے معتقد تھے مثال کے طور پر اس کے قاضی القضات ''نظام الدین عبد الملک مراغی شافعی مذہب کی پیروی کرتے تھے اور جب قاضی القضات کے منصب پر فائز ہوئے تو آزادی کے ساتھ دوسرے مذاہب کے عقیدوں کو نقض کرتے تھے اور سلطان کی طرف سے کوئی ممانعت بھی نہیں ہوتی تھی لہٰذا مناظروں کا بازار گرم ہو گیا۔ اسی میں بعض شیعہ علماء بھی ان مناظرات میں شرکت کرتے تھے جن میں علامہ حلی بھی ہوتے تھے۔ ابن بطوطہ منجملہ ان افراد میں سے ہے جو علامہ کو اولجایتو کے شیعہ ہونے کا باعث سمجھتا ہے۔ (ابن بطوطہ، ص ۱۲۸، بہ نقل از: دوانی، ج ۴/ص ۲۷۵) دوسرے مورخین بھی ان مناظرات میں علامہ کے کردار کو خدابندہ کے مذہب اہل بیتؑ کی طرف مائل ہونے میں اہم سمجھتے ہیں ایک معتبر روایت میں بادشاہ خدابندہ کے مذہب بدلنے کا سبب اولجایتو کی بیوی کے تین طلاق ہونے کی داستان اور اس سلسلہ میں علامہ کا فتویٰ بتایا گیا ہے ہر چند یہ روایت ایلخانی کے دور کے حوالوں میں

موجود نہیں ہے اور گویا کہ پہلی بار ملا محمد تقی مجلسی نے اپنی کتاب روضہ المتقین میں اسے نقل کیا ہے اور اس کے بعد اسے دوسرے منابع میں راستہ مل گیا۔

واقعہ کا خلاصہ: اولجایتو اپنی بیوی سے ناراض ہو کر ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیتا ہے اور اس کے بعد پشیمان ہو کر حلال ہونے کے بارے میں سوال کرتا ہے آخر کار اسے حلہ کے ایک فقیہ کے بارے میں اطلاع دی جاتی ہے جو اس طرح کی طلاق کو سرے سے باطل سمجھتے ہیں، سلطان نے درباری علماء کے اعتراض کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے علامہ کو سلطانیہ (قزوین میں خلافت کا مرکز) بلوایا علامہ دربار میں داخل ہوتے ہیں پہلے اپنی نعلین اٹھاتے ہیں اور سلطان کے پہلو میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں دوسرے لوگ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے دو طرح سے سلطان کی بے حرمتی کی ہے۔ ایک یہ کہ نعلین ہاتھ میں لی دوسرے یہ کہ آداب کے خلاف سلطان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ علامہ بھی حاضر جوابی اور ذہنیت میں مشہور تھے، نعلین کے بارے میں کہنے لگے: مجھے ڈر ہے کہ حنفی حضرات اسے اٹھا کر لے نہ جائیں، اس لئے کہ ابوحنیفہ بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعلین اٹھالے گئے تھے دربار میں موجود حنفی اس بات سے اچھل پڑے کہ ابوحنیفہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھے ہی نہیں علامہ نے جواب دیا ارے مجھ سے بھول ہوگئی میرا مقصد شافعی تھے تو شافعی حضرات پریشان ہوگئے اور وہی حنفیوں سا جواب دیا، مالک بن انس اور احمد بن حنبل کے بارے میں بھی انھوں نے یہی بات کہی آخر کار علامہ نے ان لوگوں کے جواب میں سلطان کے سامنے اس طرح استدلال کیا کہ حقیقت میں اہل سنت کے چار و مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کے زمانے میں نہیں تھا، جب کہ شیعہ اپنے دین اور فقہ کو امام علی سے حاصل کیا ہے کہ برسوں پیغمبرؐ کے ساتھ رہے پھر علامہ ایک ہی مجلس میں تین طلاق کے جواب میں لگ گئے اور علامہ کے دل نشین استدلال سلطان کے دل و جان میں نفوذ کر گئے اسی وقت سلطان شیعہ ہو گیا اور حکم دیا کہ بارہ اماموں کے نام سے خطبہ پڑھے جائیں اور سکے ڈھالے جائیں۔ (روضۃ المتقین، ج/۹ص/۳۰ بہ نقل از صدر الحاج سید جوادی و دیگران، ج/۱۱ص/۳۵۷)۔

سلطان کے شیعہ ہونے اور سکے ڈھالے جانے کا واقعہ ۷۰۹ھ میں پیش آیا لہٰذا علامہ کی تاریخ پیدائش کے پیش نظر جو ۶۴۸ھ میں ہوئی تھی علامہ اس وقت ۶۱ سال کے تھے اور جو بات شیعوں میں مشہور ہے کہ علامہ اس وقت نابالغ تھے ایک افسانہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے اس واقعہ کی تفصیل معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ (امین عاملی، ۱۴۰۳ھ، ج/۵ص/۳۹۹، شوشتری، گزشتہ حوالہ، ج/۲ص/۳۶۳۔۶۵۵، دوانی، گزشتہ حوالہ، ص/۲۷۶۔۲۷۱)

علامہ حلی کے ذریعہ سلطان کے شیعہ ہونے کے واقعہ نے ہر چند بعض سنی علماء (جیسے ابن تیمیہ اور ابن بطوطہ) کو ناراض کیا ہے لیکن اکثر شیعہ وسنی علماء کا عقیدہ ہے کہ اگر علامہ نے اس حساس موقع پر سلطان کی ہدایت نہ کی ہوتی تو وہ دین اسلام سے منحرف ہو جاتا اور مغل، یہودی اور بعض (بدھشٹ علماء) جو کہ اسلامی علماء اور امراء کے نفوذ سے نالاں تھے اسے اپنی جانب جذب کرتے اور شاید کہ اسلام اور مسلمانوں کا نام تک باقی نہ رہنے دیتے، لیکن علامہ نے تاریخ کے سب سے حساس لحظہ میں اسلام اور علمائے اسلام (شیعہ سنی) کے وجود کا تحفظ کیا۔

چلتے پھرتے مدرسہ کی تاسیس

سلطان محمد خدا بندہ نے شیعہ مذہب اختیار کرنے کے بعد علامہ اور ان کے بیٹے فخر المحققین کو اپنے ہی پاس رکھا اور چوں کہ اس کے بعد علامہ کو آزادی مل گئی تھی لہٰذا شیعی عقائد کی اشاعت کے لئے سلطانیہ میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جن میں متعدد کلاس کے کمرے اور دو سو شاگرد تھے۔ اسی طرح علامہ نے ایک چلتے پھرتے مدرسہ کی سفارش کی تا کہ جن مسافرتوں میں سلطان کے ساتھ ان کے بیٹے بھی ہوں، وہ طلبہ کی تربیت اور علم و دانش سے غافل نہ رہیں شوشتری لکھتے ہیں: ''حکم دیا کہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ سوتی خیمہ کا بنیا جائے آپ ہمیشہ سیاحت پر جاتے تھے اور وہاں مدرس معین کرتے تھے۔۔۔ اور سلطانیہ میں ایک مدرسہ بنایا جس میں ۱۶ درس کے لئے کمرے، مسجد اور دو سو طالب علموں کے رہنے کی جگہ تھی یہاں تک کہ ان کی حکومت کے دوران علم و کمال کا بازار اوج پر پہنچ گیا'' (شوشتری، گزشتہ حوالہ، ج ۲/ص ۳۶۰)

دوانی مرحوم کے لکھنے کے مطابق ''علامہ اپنے اس چلتے پھرتے مدرسہ کے ساتھ مختلف شہروں میں گئے، بعض جگہوں پر شاگردوں کو اجتہاد کا اجازہ دیا ہے، مثال کے طور پر ۷۰۱ھ میں تبریز کے دہخوارقان گاؤں میں کتاب ''کامل جہانی'' کے مؤلف میر عماد الدین طبری کو اجازہ دیا ہے اور ۷۰۹ھ میں ملا تاج محمود رازی کو اجازہ دیا ہے۔ (دوانی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۷۵)

یہ امور اس نکتہ کے گواہ ہیں کہ علامہ اور ان کے بیٹے فخر المحققین اسلامی معارف کی اشاعت اور شیعوں کی حیثیت کے تحفظ کے لئے اپنا وطن چھوڑا اور پورے عزم و ارادہ کے ساتھ مسافرت مین اور وطن سے دور افادہ اور استفادہ میں مصروف تھے۔

اہل سنت علماء کی نگاہ میں علامہ کا مرتبہ

اہل سنت کے بزرگ عالم ابن حجر عسقلانی کتاب ''لسان المیز ان'' جلد دوم میں رقمطراز ہیں: ''حسن بن

یوسف بن مطہر حلی شیعوں کے رہبر اور عالم ہیں ان کے مذہب کے مطابق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ غیر معمولی ذہنیت کے حامل تھے، ابن حاجب کی کتاب مختصر کی بہت ہی اچھی شرح کی ہے ان کی تصنیفات انھیں کے زمانے میں مشہور ہوگی تھیں۔ (ابن حجر، ج ۲/ص ۳۱۷)

اسی طرح ابن حجر کی کتاب ''الدرر الکامنۃ'' کی دوسری جلد میں جو انھوں نے آٹھویں صدی ہجری کے بزرگوں کی سوانح کے سلسلہ میں تالیف کی تھی لکھتے ہیں: ''انھوں (علامہ) نے اصول وحکمت میں بہت سی کتابیں لکھیں ہیں، وہ حلہ کے شیعوں کے رہبر تھے، ان کی تصنیفات انھیں کے زمانے میں مشہور ہوگئیں، علماء کی ایک جماعت انھیں کے حضور میں پروان چڑھی، ابن حاجب کی کتاب مختصر کی جو شرح انھوں نے کی ہے وہ الفاظ اور معنی کی تقریب کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہے، امامیہ فقہ میں ان کی بہت سی کتابیں ہیں انھوں نے اپنے پورے وقت کو اسی لئے وقف کر دیا تھا، عمر کے آخری ایام میں حج کرنے گئے تو ان کے شاگردوں کا ایک گروہ وہیں پر فارغ التحصیل ہوا'' (عسقلانی، ج ۲/ ۱۳۵۔۱۵۸، بہ نقل از: دوانی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۵۳/ ۲۵۴، امین عاملی، گزشتہ حوالہ، ص ۳۹۸/)

اہل سنت کے بزرگ عالم صاحب تفسیر مشہور ''انوار التنزیل'' عبداللہ بن عمر بیضاوی (وفات ۶۸۵ھ) جو فقہ میں شافعی مذہب اور کلام میں اشعری تھے علامہ کو اعلیٰ اوصاف کے ساتھ یاد کرتے ہیں بیضاوی ایک اصولی مسئلہ کے لئے علامہ کے پاس ایک خط لکھتے ہیں اور خط کے شروع میں علامہ کو اس طرح خطاب کرتے ہیں: ''**یا مولانا جمال الدین ادام الله فواضلک ، انت امام المجتهدین فی علم الاصول و ...** ''(امین عاملی، گزشتہ حوالہ، ص ۴۰۱/)

یہ خط اس وقت لکھا گیا جب کہ بیضاوی عمر میں علامہ سے برسوں بڑے تھے اور اگر یہ خط بیضاوی کی عمر کے آخری ایام، یعنی ۶۸۵ھ میں بھی لکھا گیا ہو تو بھی علامہ اس وقت ۳۷ سال سے کم عمر کے تھے، بہر حال علامہ بھی قاضی بیضاوی کے جواب میں ایک مخصوص انداز میں احترام کے ساتھ لکھتے ہیں: ''**وفقت علیٰ افادة مولائی الامام ادام الله فضائله و اسبغ علیه فواضله ...** ''(گزشتہ حوالہ)

علامہ نے خط مکمل ہونے کے بعد اسے بیضاوی کی خدمت میں شیراز بھیج دیا جب قاضی بیضاوی نے جواب ملاحظہ کیا تو علامہ کی بڑی تعریف کی۔ (افندی اصفہانی، ۱۴۰۱ھ، ج ۱/ص ۳۸۳/)

واضح سی بات ہے اس طرح کی علمی نامہ نگاری دو بزرگ شیعہ وسنی عالم کے درمیان نہایت سالم ماحول اور بے حد احترام کے سایہ میں انجام پائی، خود یہ موضوع شیعوں اور سنیوں کے لئے درس ہے تا کہ ایک دوسرے کے احترام میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

اہل سنت کے ایک اور بزرگ عالم صلاح الدین صفدی علامہ کو ''امام، ذوالفنون، عالم، فقیہ، علامہ اور صاحب التصانیف'' جیسے القاب سے نوازتے ہیں اوران کا تعارف معقولات اور علم کلام کے امام اور رہبر کے عنوان سے کرتے ہیں۔صلاح الدین اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اضافہ کرتے ہیں: ''وہ بہت زیادہ باغ اور زمین وغیرہ کے مالک تھے، سواری کی حالت میں کتاب لکھتے تھے انھوں نے ابن حاجب کی کتاب ''مختصر کی شرح کی ہے اوران کی یہ شرح ان کی زندگی میں ہی مشہور ہو چکی تھی، اسی طرح امامت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کے جواب میں ابن تیمیہ نے تین جلدی کتاب لکھی اور ابن تیمیہ انھیں ابن المنجس کہتا تھا لیکن ابن المطہر اخلاق وعلم میں بہترین نام کے حامل تھے'' (صفدی، ۱۹۸۴ء، ج ۱۳، ص ۸۵)

علامہ کے اساتذہ اور شاگرد

علامہ اس زمانے کی نمایاں علمی شخصیت تھے جس نے بچپن سے ہی علم کے میدان میں قدم رکھا، اسی لئے بہت سے استاد سے فیض حاصل کیا جن کے نام بیان کرنا اس مقالہ کی گنجائش سے باہر ہے۔ دوسری طرف چوں کہ وہ نہایت ذہین تھے لہٰذا بہت ہی جلد مختلف علوم میں ماہر ہو کر استاد بن گئے اور یہی امر ان کے درس میں دور ونزدیک سے ان کی طرف طلبہ کے بہت زیادہ آنے کا سبب بنا اسی وجہ سے اس مقالہ میں ان کے سبھی شاگردوں کے نام بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا فقط کچھ مشہور اساتذہ اور شاگردوں کے تعارف پر اکتفا کی جارہی ہے۔

ان کے سب سے پہلے استاد ان کے والد سدید الدین حلی تھے جنھوں نے ان کی آنکھوں کو نور علم سے منور کیا، پڑھنا، لکھنا اور عربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے ماموں ''نجم الدین محقق حلی'' (متوفائے ۶۷۶ھ) کے اصول اور فقہ کے درس میں شرکت کی اور اپنی انتھک کوشش دلچسپی کو اس راہ میں جاری رکھا یہاں تک کہ نوجوانی میں درجۂ اجتہاد تک پہنچ گئے پھر علوم عقلی کی طرف رخ موڑا اور ''خواجہ نصیر الدین طوسی (وفات ۶۷۲ھ) کے حضور میں ریاضیات فلکیات، اور فلسفہ سیکھا۔ علامہ نے خواجہ کو ایک ماہر اور نکتہ سنج استاد پایا اور خواجہ کی عمر کے آخری دم تک ان کے سامنے زانو ادب تہہ کرتے رہے یہاں تک کہ مسافرتوں میں بھی اور اس وقت بھی جب خواجہ مراغہ میں رصد خانہ کی تاسیس میں سرگرم عمل تھے علامہ ان کے ہمراہ تھے۔ (افندی اصفہانی، گزشتہ حوالہ، ص ۳۵۹)

علامہ حلی کے اساتذہ میں سے ایک شارح نہج البلاغہ ''کمال الدین بن میثم بحرانی بھی ہیں جو اس وقت بحرین میں رہتے تھے اور حلہ کے بزرگ علماء کی دعوت پر اس شہر میں آئے تھے۔ موصوف علم فلسفہ، فقہ اور حدیث میں اس زمانے کے ماہر تھے، اپنی سکونت کے ایام میں محقق حلی اور حلہ کے دوسرے اساتذہ کے ساتھ علمی ملاقاتیں ہوئی

ہیں محقق حلی نے ان کے علم کا اعتراف کیا ہے۔(دوانی گزشتہ حوالہ،ص/۱۹۵،طریحی،ذیل مادہ ہیثم،۱۳۶۵ھ ش)

اسی طرح علامہ نے دوسرے بزرگوں جیسے ''سید جمال الدین احمد بن طاؤس حسنی'' (وفات ۶۷۳ھ)، ''سید رضی الدین ابن طاوؤس حسنی'' و''سید احمد عریضی'' اور صاحب کتاب کشف الغمہ ''بہاء الدین علی بن عیسیٰ اربلی'' (وفات ۶۹۳ھ) نیز دوسرے بہت سے شیعہ علماء کی شاگردی کی ہے (دوانی، گزشتہ حوالہ،ص/۲۵۳)

علامہ کے سنی اساتذہ بھی بہت ہیں ان میں سے مشہور شافعی حکیم ''نجم الدین کاتبی قزوینی'' جو دبیران کے لقب سے مشہور تھے۔''برہان الدین نسفی''۔''جمال الدین حسین بن ابان نحوی''۔فقیہ عزالدین فاروقی واسطی''، ''تقی الدین عبداللہ بن جعفر بن علی صباغ حنفی کوفی'' اور قطب الدین شیرازی کے بھانجے ''شمس الدین محمد بن احمد کیشی'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔(گزشتہ حوالہ)

تالیفات علامہ

بہت سے علماء علامہ کی تالیفات کے سلسلہ میں اختلاف رکھتے ہیں ''شیخ فخر الدین طریحی'' وفات ۱۰۸۵ھ کتاب مجمع البحرین میں مادہ ''علم'' کے ذیل میں جب علامہ تک پہنچتے ہیں تو لکھتے ہیں: '' **لـــــه كثيـــر مـــن التصانيف و عن بعض الافاضل : و جد بخطه خمس مأة جلد من مصنفاته غيره من تصانيفه** '' (طریحی، گزشتہ حوالہ، ج/۵،ص/۱۲۳)

ترجمہ: (علامہ کی بہت زیادہ تصنیفات ہیں بعض افاضل سے منقول ہے کہ: ان کی تصنیفات میں دوسروں کے خط کے علاوہ خود ان کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی پانچ سو جلد ان کی تصنیفات ملی ہیں)

صاحب اعیان الشیعہ لکھتے ہیں ''علامہ کی تالیفات ایک سو کتابوں سے زیادہ ہیں جن میں سے میں نے ۹۵ عدد دیکھی ہیں ان میں سے بہت سی چند جلدوں میں ہیں'' (امین عاملی، گزشتہ،ص/۴۰۲) اگر چہ خود امین نے علامہ کی کتاب کی شمارش کے وقت بعد کے صفحوں میں ان کی کتابوں کی تعداد ۱۰۹ تک پہنچائی ہے۔(گزشتہ حوالہ ص/۴۰۴)

ریحانۃ الادب میں علامہ کی تالیفات ۱۲۰ کتابیں بتائی گئی ہیں۔(مدرس تبریزی، ج/۴ص/۱۶۸،۱۳۷۴ھ ش)

یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر چہ علامہ نے بہت ہی نفیس اور زیادہ تالیفات دنیائے علم و دانش کے حوالے کی ہیں لیکن پھر بھی بعض علماء نے ان کی تصنیفات بتانے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور حقیقت سے دور باتیں کی ہیں، مثال کے طور پر کہتے ہیں علامہ کی تالیفات کی کثرت اس حد تک ہے کہ اگر ان کی زندگی کے ایام (جو ۷۶ سال ہے) ہر روز کے مقابلہ میں حساب لگایا جائے تو انھوں نے ہر روز ایک ہزار سطر لکھی ہوگی۔اس مطلب کی وضاحت ''محمد بن

خاتون عاملی'' نے کی ہے جو شیخ بہائی کی کتاب شرح الاربعین کے شروع میں ہے۔ (افندی اصفہانی، گزشتہ، ص/ ۳۶۳) جب کہ علامہ کی تصنفات معلوم اور محفوظ ہیں اور جوانی سے لے کر عمر تک کے آخری ایام تک ان کی تصنیفات کا حساب لگایا جائے تو انھوں نے تخمینی طور پر روز آنہ دو سو سطر سے زیادہ نہیں لکھا ہے۔

بہر حال علامہ کی تالیفات کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ علامہ کی عظمت و بزرگی کی حکایت کرتا ہے جو اس عظیم انسان کی لامحدود کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہاں تک کہ سواری کی حالت میں بھی لکھنے سے غافل نہیں ہوتے تھے علامہ کے کام کی اہمیت اس میں ہے کہ انھوں نے نقلی و عقلی علوم سے متعلق بہت سی کتابیں تالیف کیں۔ جن کی کثرت نے ان کے آثار کی شمارش کے وقت دانشوروں کو اختلاف میں مبتلا کر دیا ہے۔

جیسا کہ تاریخ نویسوں نے لکھا ہے علامہ کی تالیف فقہ، اصول، فلسفہ، کلام، حدیث اور رجال وغیرہ میں تقریباً ستر ۷۰ موضوعات پر ہیں۔ جن میں سب سے بڑی ''تذکرہ'' ہے اور سب سے چھوٹی ''تبصرہ'' ہے اور ان دو کتابوں کے درمیان ''التلخیص، الارشاد، التحریر، القواعد، منتھی المطلب، مختلف الشیعۃ، جیسی کتابیں ہیں (جب کہ خود یہ کتابیں بھی بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں) بعض نے کہا ہے کہ کتاب ''منتھی المطلب'' کتاب ''تذکرۃ الفقہا'' سے بڑی ہے۔ (افندی اصفہانی، گزشتہ، ص/ ۳۶۲)

لیکن علامہ نے اپنی رجال کی کتاب ''خلاصۃ الاقوال'' میں اپنی تالیفات کو ۵۷ بتایا ہے جن میں سے بعض چند جلدی ہیں۔ (خلاصۃ الاقوال، ص/ ۴۵) یہ اس وقت ہے جب علامہ نے کتاب خلاصہ کو ۶۹۳ھ میں مکمل کیا اور یہ بعید نہیں کہ اس کے بعد سے اپنی عمر کے آخری ایام ۷۲۶ھ تک دوسری کتابیں بھی تالیف کی ہوں جیسا کہ علامہ نے سید مہنا کے جواب میں جو انھوں نے اپنی وفات کے ۲۴ سال پہلے دیا ہے، ایسی کتابوں کا نام لیا ہے جن میں سے بعض کا تذکرہ دوسری جگہوں پر ہوا ہی نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے علامہ کے زمانے میں حالات سازگار ہونے کے سبب ان کی بہت سی کتاب محفوظ رہیں اور آج ہمارے اختیار میں ہیں یہاں ہم اختصار کے پیش نظر ان کی بعض کتابیں الفبا کے لحاظ سے ذکر کر رہے اور ان کی کتابوں کی مکمل فہرست سے باخبر ہونے کے لئے قارئین محترم کو ان حوالوں کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہتے ہیں جو اسی مقالہ کے آخر میں ہیں:

۱۔ استقصاء الاعتبار فی تحقیق معانی الاخبار، یہ کتاب علامہ کے قول کے مطابق خلاصہ میں بے مثال ہے۔

۲۔ الالفین فی الامامۃ، علامہ کا مقصد امامت ثابت کرنے کے لئے دو ہزار نقلی و عقلی دلیل قائم کرنا تھا لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور تقریباً ۱۲۰۰ دلیل ذکر کی ہے۔

۳۔ انوار الملکوت فی شرح فص الیاقوت، کتاب یاقوت کی شرح ہے جس کے مؤلف ابوالحسن ابراہیم نوبختی

ہیں یہ کتاب علم کلام میں ہے۔

۴۔ ایضاح الاشتباہ، اس کتاب میں علامہ نے راویوں کے نام قلم بند کئے ہیں۔

۵۔ ایضاح التلبیس من کلام الرئیس، اس کتاب میں علامہ نے ابن سینا کے ساتھ احتجاج کیا ہے۔

۶۔ الباب الحادی عشر، یہ کتاب علم کلام (عقائد) کے بارے میں ہے جس کی شرح فاضل مقداد سیوری نے کی ہے۔

۷۔ بسیط الکافیہ، یہ کتاب شیخ رضی الدین استرآبادی (وفات ۶۸۶ھ) کی کتاب شرح کافیہ کا خلاصہ ہے۔

۸۔ تحریر احکام الشریعۃ علی مذہب الامامیۃ، یہ کتاب امامیہ فقہا کے فتوؤں کے مطابق فقہ کا ایک مکمل دورہ ہے جو علامہ کی دوسری کتابوں سے آسان لکھی گئی ہے۔

۹۔ تذکرۃ الفقہاء، جو کتاب النکاح تک موجود ہے اور یہ علامہ کی ایک اور نفیس کتاب ہے جس کی کتاب منتھی المطالب پر برتری میں اختلاف ہے۔

۱۰۔ حل المشکلات من کتاب التلویحات، کتاب تلویحات شیخ اشراق سہروردی کی تالیفات میں سے ہے۔

۱۱۔ خلاصۃ الاقوال فی معرفۃ الرجال۔

۱۲۔ الدر والمرجان فی اخبار الصحاح والحسان، دس جلدوں میں۔

۱۳۔ شرح مختصر الاصول، اہل سنت کے مشہور عالم ابن حاجب کی کتاب کی شرح ہے جو علم اصول اور جدل کے موضوع پر تالیف ہوئی ہے۔

۱۴۔ قواعد الاحکام فی معرفۃ الحلال والحرام، یہ کتاب علامہ کی فقہی کتابوں میں سب سے محکم اور دقیق ہے۔

۱۵۔ کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد، یہ خواجہ نصیر الدین طوسی کی کتاب تجرید کی پہلی شرح ہے کہا جاتا ہے کہ اگر علامہ یہ کتاب نہ لکھتے تو کوئی بھی خواجہ کا مقصد سمجھ نہیں سکتا تھا، کتاب تجرید کی شرح کرنے والے سبھی حضرات جیسے قوشجی، لاہیجی اور دوانی علامہ کی شرح کے ذریعہ ہی خواجہ کی مراد تک پہنچ سکے ہیں۔

۱۶۔ کشف المقال فی معرفۃ الرجال، معروف بہ رجال کبیر جو علم رجال میں علامہ کا سب سے جامع اثر ہے۔

۱۷۔ کشف المکنون من کتاب القانون، جو علم نحو میں جزولیہ کی مختصر شرح ہے۔

۱۸۔ کشف الیقین فی فضائل امیر المومنینؑ، یہ کتاب ''آئینہ تعیین'' کے نام سے فارسی زبان میں ترجمہ ہوئی ہے

۱۹۔ المباحث السنیۃ فی المعارضات النصیریۃ، اس کتاب میں علامہ نے اپنے استاد خواجہ نصیر الدین طوسی کے ساتھ اختلافات کا ذکر کیا ہے۔

۲۰۔ مبادی الوصول الیٰ علم الاصول، ایک مختصر کتاب ہے جس میں اصول کے ابتدائی مطالب مذکور ہیں۔

۲۱۔ مختلف الشیعہ فی احکام الشریعۃ، اس کتاب میں شیعہ فقہا کے مختلف نظریات کی تحقیق کی گئی ہے۔

۲۲۔ مصابیح الانوار فی جمع جمیع الاخبار، شیعہ راویوں کی احادیث کا مجموعہ جو موضوع کے اعتبار سے تقسیم ہوئی ہے

۲۳۔ المقاصد الوافیۃ بفوائد القانون والکافیۃ، دو کتاب ''جزولیہ'' اور ''شرح الکافیۃ'' کی توضیح ہے۔

۲۴۔ منتہی المطالب فی تحقیق المذہب، تمام عبادات اور کچھ معاملات پر مشتمل ہے اس کتاب کے بارے میں خود علامہ فرماتے ہیں: ''اس طرح کی کوئی کتاب تالیف نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اس کتاب میں مسلمانوں کے سبھی فقہی مذاہب (شیعہ سنی) کے نظریات بیان کئے ہیں۔

۲۵۔ النکت البدیعۃ فی تحریر الذریعۃ، سید مرتضی علم الھدیٰ کی کتاب الذریعہ پر حاشیہ ہے۔

۲۶۔ نہایۃ الاحکام، جو طہارت سے لے کر بیع کے آخر تک شامل ہے۔

۲۷۔ نہایۃ الوصول الیٰ علم الاصول، چار جلدوں میں۔

۲۸۔ نہایۃ المرام فی علم الکلام۔

۲۹۔ نہج الایمان فی تفسیر القرآن، یہ کتاب کشاف زمخشری اور تبیان طوسی کی تفسیروں کا اقتباس ہے۔

۳۰۔ نہج الحق وکشف الصدق، اس کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فضل بن روز بہان اشعری نے اس کے جواب میں حاشیہ کی صورت میں ابطال الباطل نامی کتاب لکھی ہے، اور قاضی نور اللہ شوشتری نے بھی روز بہان کی کتاب ابطال الباطل کا جواب لکھا ہے۔

غروب آفتاب حلہ

علامہ حلی ایران کے سفر سے واپس آنے کے بعد تقریبا دس سال اپنی جائے پیدائش حلہ میں رہے اپنی آخری عمر میں خانہ خدا (مکہ) کا سفر کیا اور حج سے واپس آنے کے بعد ۲۱ محرم ۷۲۶ھ کو ۷۷ سال کی عمر میں شہر حلہ میں اپنے معبود کی بارگاہ میں چلے گئے، ان کی تشییع جنازہ اور دفن وکفن کی جزئیات سے متعلق حوالوں اور منابع میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے، لیکن ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان کا جنازہ شہر حلہ سے تشییع ہو کر نجف اشرف منتقل ہوا اور حرم کے شمالی گلدستہ کے کنارے ایوان طلا میں ایک مخصوص مقبرہ کے اندر اپنے مولا امیر المومنینؑ کے پہلو میں دفن ہوئے، آج ان کا مرقد علم وحکمت کے دوستداروں اور زائروں کے لئے تبرک اور زیارتگاہ بنا ہوا ہے۔ (بحرانی) بی تا، ص ر ۲۲۷) ان کی روح شاد اور یاد زندہ باد۔

حوالہ جات

۱۔ افندی اصفہانی، عبداللہ ریاض العلماء وحیاض الفضلاء تحقیق سید احمد حسینی، مطبعۃ خیام قم ۱۴۰۱ھ

۲۔ امین عاملی، سید محسن، اعیان الشیعہ (قطع بزرگ)، تحقیق حسن امین، دار التعارف للمطبوعات بیروت، ۱۴۰۳ھ۔

۳۔ انصاری، شیخ مرتضی، فرائد الاصول، چاپ کنگرہ، مجمع الفکر الاسلامی، قم، ۱۴۲۲ھ۔

۴۔ بحرانی، یوسف بن احمد لولؤ البحرین فی الاجازات وتراجم رجال الحدیث، تحقیق بحر العلوم، سید محمد صادق موسسہ آل البیتؑ، قم بی تا۔

۵۔ دوانی، علی، مفاخر اسلام، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تہران، ۱۳۷۸ھ ش

۶۔ زرکلی، خیر الدین، الاعلام قاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۰ء۔

۷۔ ساعی، محمد باقر، ترجمہ ریاض العلماء، بنیاد پژوہش ہای آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۶۶ھ ش۔

۸۔ شوشتری، قاضی نور اللہ، مجالس المومنین، انتشارات اسلامیہ، تہران، طبع چہارم ۱۳۷۷ھ ش۔

۹۔ صدر حاج سید جودی ودیگران، دائرۃ المعارف تشیع، نشر شہید سعید محبی، تہران، ۱۳۸۴ھ ش

۱۰۔ صفدی، صلاح الدین خلیل بن ایبک، الوافی باوفیات، بہ کوشش، محمد الحجیر ی، دار النشر فرانتس اشتایز رجمعیت مستشرقین آلمان)، بیروت، ۱۹۸۴ء۔

۱۱۔ طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، تحقیق سید احمد الحسینی، منشورات المکتبۃ المرتضویۃ، تہران طبع دوم، ۱۳۶۵ھ ش

۱۲۔ طہرانی، آقا بزرگ، طبقات اعلام الشیعہ، اسماعیلیان، قم بی تا۔

۱۳۔ عسقلانی، ابن حجر الدورا الکامنۃ فی اعیان المئۃ الثامنۃ۔

۱۴۔ مدرس تبریزی، ریحانۃ الادب فی تراجم المعروفین بالکنیۃ اواللقب، انتشارات خیام، تہران، طبع چہارم، ۱۳۷۴ھ ش۔

۱۵۔ موسوی خوانساری، محمد باقر، روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات، اسماعیلیان، بی تا۔

۱۶۔ نعمہ، عبداللہ، فلاسفۃ شیعہ، ترجمہ سید جعفر گضبان، سازمان انتشارات وآموزش انقلاب اسلامی، تہران، ۱۳۶۷ھ ش۔

شیخ محمد مصطفیٰ مراغی، الازہر کے جوان سال مفتی

عزالدین رضانژاد[1]
ترجمہ: شاہد حسین رضویش

تمہید

چودہویں صدی ہجری میں اسلامی مذاہب کی تقریب میں پیش قدمی کرنے والوں میں سے ایک اہل سنت کے عظیم عالم اور الازہر کے جوان سال مفتی، استاد شیخ محمد مصطفیٰ مراغی ہیں، علمی اور دینی میدان میں آپ کی اصلاح پسند فکر اور سماجی امور میں امت مسلمہ کے اتحاد و بھائی چارگی اور ثقافت میں اہتمام کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک کی زبان پر آپ کا قصیدہ تھا، ہم اس مختصر مقالہ میں اس اتحاد پسند شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

پیدائش اور تعلیم

صوبہ سوہاج کے شہر مراغہ میں علم و دانش سے لگاؤ رکھنے والے خاندان میں پانچ مارچ ۱۸۸۱ء اور (بقولے) نو مارچ ۱۸۸۱ء مطابق ۱۲۹۸ھ کو ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمد مصطفیٰ رکھا گیا۔

نو جوانی میں قرآن مجید حفظ کر کے آپ نے دانشگاہ الازہر میں داخلہ لیا اور وہاں بڑے بڑے اساتذہ سے بہرہ مند ہوئے، وہ عمر کے لحاظ سے سب سے جوان سال اور کم سن شخص ہیں جو علم کے ''العالمیہ'' درجہ پر فائز ہوئے۔ محمد مصطفیٰ سارے طلبہ میں ممتاز تھے اور ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں ۲۳ سال کی عمر میں استاد امام محمد عبدہ اور دوسرے علماء کے حضور امتحان دے کر کامیاب ہوئے جس کے بعد الازہر کے مختلف منصب کی ذمہ داری سنبھالی۔

۱۔ استادیار، مدرس حوزہ و دانشگاہ، مرکز جہانی (موجودہ جامعۃ المصطفیٰ) علوم اسلامی کی علمی کمیٹی کے رکن

اخلاقی خصوصیات

استاد مراغی اپنے قوی حافظہ اور ذاتی ذہنیت کے سبب فکری مستقل مزاجی میں مشہور تھے۔ اپنے مخالفوں کے ساتھ برتاؤ میں ان کا احترام کرتے تھے۔ منافقت اور چاپلوسی سے دور تھے۔ بہت زیادہ جدوجہد کرتے تھے۔ ہمیشہ کام میں مشغول رہتے تھے لیکن تھکان کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

تالیفات

استاد مراغی نے تفسیر قرآن، فقہ، ادبیات عرب اور اصلاحی منصوبے خاص کر دانشگاہ الازہر سے متعلق منصوبے اور خاندانی قوانین سے متعلق بہت سے قلمی آثار چھوڑے ہیں، ان کے نہایت اہم موجودہ علمی آثار حسب ذیل ہیں:

۱۔ الاولیاء والمحجوون، اس کتاب میں فقہی مباحث شامل ہیں، یہ کتاب الازہر کے کتب خانہ میں اسی طرح خطی محفوظ ہے، وہ انھیں عمیق فقہی بحثوں کے سبب ''انجمن کبار لاعلماء'' کے رکن قرار پائے۔

۲۔ تفسیر جزء تبارک، استاد مراغی نے اس تفسیر کو استاد محمد عبدہ کی تفسیر ''جزءعم'' کے تکملہ کا عنوان قرار دیا۔

۳۔ قرآن کریم کے ترجمہ کے وجوب سے متعلق مقالہ۔

۴۔ ''الزمالۃ الانسانیۃ'' کے عنوان سے لندن میں ادیان کانفرنس کے لئے مقالہ۔

۵۔ اسلامی قوانین اور شادی کے قانون کے مستندات سے متعلق بحثیں نمبر ۲۵، ۱۹۲۹ء

۶۔ بلاغت اور ادبیات عرب سے متعلق بحثیں۔

۷۔ درسی جزوات جس میں قرآن مجید کے بعض سوروں کی تفسیر شامل ہے اور الازہر مجلّہ میں شائع ہوئی ہے، یہ دروس قاہرہ اور اسکندریہ کی بڑی بڑی مسجدوں میں پڑھائے جاتے تھے جن میں ملک فاروق ۱۳۵۶ھ سے ۱۳۶۴ھ تک حاضر ہوتا تھا۔

شیخ مراغی اپنے ہم عصروں کی نظر میں

شیخ مراغی کا علمی مرتبہ اور اعلیٰ مقام کسی پر پوشیدہ نہیں ہے، مزید یاد دہانی کی خاطر ان کے بارے میں بعض بزرگوں کے اقوال پیش کر رہے ہیں۔

الف)۔ ڈاکٹر سید محمد طنطاوی، مفتی الازہر:

اگر چہ شیخ مراغی کی عمر نہایت ہی کم تھی لیکن ان کی حیات علمی آثار کے پیش نظر بہت ہی طویل ہے۔

ب)۔ڈاکٹر نعمات احمد فواد:

شیخ مراغی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے دینی علوم اور طبیعی علوم کو یکجا کیا۔ وہ جس طرح قرآن کے علمی اعجاز کے معتقد تھے اسی طرح ادبیات کے شوقین بھی تھے اور اس سلسلہ میں ان کی نظم ونثر موجود ہے، انھوں نے ادیان کا تطبیقی مطالعہ اور تدریس شروع کی تا کہ اس طرح اسلام کا درخشاں چہرہ پہنچوائیں وہ اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ علمی وفلسفی ترقی میں جنگ سے رکاوٹ بننے کی قوت نہیں ہے اور علمی ترقی کی دنیا درندگی اور جناتیوں کی شاہد ہے فقط اسلام ہی جنگ اور خون کی ہولی سے روک سکتا ہے۔

ج)۔ڈاکٹر محمد نائل، سابق صدر دانشکدہ زبان عربی اور امام مراغی کے دوست:

استاد مراغی ایسی انقلابی شخصیت تھے جو حق کی راہ میں کسی سے ڈرتے نہیں تھے۔

علمی اور عملی ذمہ داریاں

۱۔ شیخ مراغی فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں اپنے استاد شیخ محمد عبدہ کی طرف سے قاضی منصوب ہوئے تا کہ سودان کے شہر ''دنقلہ'' میں، قضاوت کے امور انجام دیں، انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی اور ۱۹۰۷ء یعنی تین سال تک قضاوت میں مصروف رہے۔ اور چوں کہ سودان کی فوج کا انگریز کمانڈر ہمیشہ ان کی مخالفت کرتا تھا لہٰذا وہ استعفاء دے کر مصر واپس آ گئے۔

۲۔ ۱۹۰۷ء سے مصر میں قاضی کے منصب پر رہ کر قضاوت میں مصروف رہے یہاں تک کہ ۱۹۲۳ء میں مصر کی عالی شرعی عدالت کی صدارت کے درجہ پر فائز ہوئے۔

۳۔ ۱۹۲۸ء میں ۴۷ سال کی عمر کے بعد شیخ الازہر کے عنوان سے منتخب ہوئے وہ الازہر کی تاریخ میں سب سے جوان شخص تھے جو اس منصب پر فائز ہوئے۔

۴۔ الازہر کی ساخت وساز اور تعلیمی منصوبے میں ان کے اصلاحی نظریات ملک فؤاد کی مخالفت کی نذر ہو گئے اور انھوں نے الازہر کی صدارت سے استفادہ دے دیا۔

۵۔ الازہر کے اساتذہ اور طلبہ کے احتجاج اور فشار کے سبب ملک فواد کو اپنا نظریہ بدلنا پڑا اور شیخ مراغی دوبارہ اپریل ۱۹۳۵ء میں الازہر کے صدر منتخب ہوئے اور الازہر کی دینی وعلمی ترقی میں دس سال تک کوشاں رہنے کے بعد آخر کار آپ نے ۲۲/اگست ۱۹۴۵ء میں دار فانی کو وداع کہی۔

اصلاحی تصور اور اسلامی مذاہب میں تقریب کی فکر

استاد مراغی کو الازہر کے مسائل، قضاوت اور اسلامی مذاہب کی تقریب کے سلسلہ میں اصلاح پسند سمجھنا چاہئے وہ ہمیشہ وہی طریقہ کار اختیار کرتے تھے جو ان کے استاد شیخ عبدہ کا تھا، ذیل میں ہم ان کی اصلاح پسند فکر اور عملی و دانشگاہی معاشرے کو مذاہب کے ترقی پسند قوانین سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کی دعوت کے چند نمونوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

الف)۔قضاوتی اصلاحات

شیخ مراغی مرحوم نے عدالت اور لوگوں کے امور میں اصلاح کے لئے خاص طریقہ کار اختار کر رکھا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ قاضی کو اپنا حکم قرآن اور سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ حاصل کرنا چاہئے اور غیر مذہبی قوانین کو بالئے طاق رکھ دینا چاہئے، قاضی کو الٰہی ولایت کے سوا ہر طرح کی طاقت کے قبضہ سے باہر ہونا چاہئے تا کہ کسی خوف اور ڈر کے بغیر معاشرے میں عدالت قائم کر سکے ان کا عقدہ تھا کہ قضاوت کے قوانین کی اصلاح قضاوت کا نصف کام ہے اسی وجہ سے اپنی صدارت میں ایک کمیتی تشکیل دی تا کہ مصر میں احوال شخصیہ سے متعلق قوانین کی دوبارہ تحقیق کی جائے، انھوں نے کمیٹی کے ارکان کو کسی مخصوص مذہب سے مقید ہونے سے منع کیا۔

چوں کہ مصر کے قاضی صرف حنفی فقہ کے مطابق فیصلہ کرتے تھے لہٰذا استاد مراغی نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سارے مذاہب کے نظریئے کو پیش نظر رکھیں تا کہ معاشرے کی مصلحت کے وقت اسے اخذ کریں۔ انھوں نے کمیٹی کے ارکان سے یہ کہہ رکھا تھا کہ ''ایسا قانون بنائیں جو زمان و مکان کے مطابق ہو اس لئے کہ شریعت اسلام میں اتنی آسانی اور وسعت موجود ہے کہ ہم مدنی اور جزائی حقوق سے متعلق اس کے فرعی احکام کو اس طرح اخذ کریں جو ہر زمانے میں مفید واقع ہو''

ب)۔الازہر کی اصلاح

شیخ کے کارناموں میں اولویت کے حامل امور میں سے ایک الازہر کی ترقی اور تکمیل تھی جب انھوں نے الازہر کی مسؤلیت سنبھالی تو ایک انجمن بنائی تا کہ وہ الازہر کے موجودہ قوانین اور تعلیمی منصوبوں کی تحقیق کرے۔ دوسری جانب انھوں نے پہلے ملک فواد کو جو اس زمانے میں الازہر کے امور کا مالک تھا کچھ قوانین دکھائے لیکن بادشاہ کے حوالیوں نے سوچا کہ شیخ مراغی الازہر کو بادشاہ کے دربار سے جدا کرنا چاہتے ہیں اسی وجہ سے بادشاہ نے ان قوانین کو رد کر دیا، استاد مراغی نے اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ یا الازہر کی اصلاح کے لئے مخصوص قانون

بنائیں یا الازہر کی صدارت سے استعفاء دیں، ملک فواد نے ان کا استعفاء قبول کرلیا، لیکن اساتذہ اور طلبہ کے احتجاج نے جو چار مہینہ تک جاری رہا ملک فواد کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ شیخ مراغی کو دوبارہ الازہر کی صدارت سونپے۔

شیخ مراغی نے دوبارہ الازہر آنے کے بعد تین دانشکدہ کی بنیاد ڈالی جس میں تعلیم کی مدت چار سال تھی اور طالب علم کسی ایک سبجکٹ میں ماہر بنتا تھا۔

تینوں دانشکدہ حسب ذیل ہیں:

۱) دانشکدہ زبان عربی، ۲)۔ دانشکدہ شریعت وقانون۔ ۳)۔ دانشکدہ اصول دین (عقائد) استاد مراغی کی تاکید تھی کہ درسی مسئلہ میں تقلید وتلقین سے پرہیز کیا جائے اور نئے نئے طریقہ کار کو اختیار کیا جائے اور نظریہ پیش کرنے اور اجتہاد میں وسعت دی جائے۔

انھوں نے اس بات کے پیش نظر کہ طلبہ غیر مسلموں کو اسلامی ثقافت اور اسلام کا پیغام پہنچا سکیں یہ حکم دیا تھا کہ غیر ملکی زبانوں کی تعلیم دی جائے اسی طرح بڑے بڑے علماء کو شریک کر کے دانشگاہ الازہر میں فتویٰ دینے والی ایک کمیٹی بنائی تا کہ لوگوں اور جماعتوں کے دینی سوالات کا جواب دیا جا سکے نیز عالم اسلام میں سب سے بڑی مذہبی کمیٹی تشکیل دی جس میں ۳۰ عالم دین تھے اور اس میں رکنیت کی شرط یہ تھی عالمی سطح پر دینی ثقافت کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ایک رسالہ شائع کریں جو ان کی علمی طاقت اور جدت عمل کی دلیل ہو۔

ج)۔ اسلامی مذاہب کی تقریب

شیخ مراغی کی دوسری فعالیت اسلامی مذاہب میں اتحاد اور تقریب کی دعوت دینا اور مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو ایک دسرے سے نزدیک کرنا ہے اس سلسلہ میں انھوں نے بے انتہا کوشش کی منجملہ آقا خان (اسماعلیہ کے رہبر) سے ان کی گفتگو اس مقصد سے تھی کہ دینی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دیں جس کا سب سے پہلا کام تھا کہ پوری دنیا میں تمام مسلمانوں کے درمیان گہرے تعلقات قائم کرے تا کہ اسلامی ممالک میں تعلیمی جماعتوں کے ساتھ ایک قسم کا تعاون ہو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے نزدیک اور مبروط کی جائے ہر چند وہ مختلف فرقوں اور مذہبوں کے ہوں۔

ان ہی کوششوں کی وجہ سے شیخ مصطفٰے مراغی چودہویں صدی ہجری میں مذاہب کی تقریب میں پیش قدم اور سب سے آگے جانے جاتے ہیں۔

شیخ کی وفات اوران کی یاد

شیخ مراغی نے اپنی عمر کی ۶۴ بہاریں گزارنے کے بعد ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۱ راگست ۱۹۴۵ء بروز بدھ آخرت کا سفر اختیار کیا۔ شیخ مراغی کے انتقال کی خبر شائع ہوتے ہی عالم اسلام میں کہرام برپا ہوگیا۔ مصر میں خود ملک فاروق مسجد میں بیٹھ کر غم منا رہا تھا اوراس نے نمازیوں سے شیخ مراغی الازہر کے صدر اور مفتی کی روح کی خوشحالی کے لئے فاتحہ پڑھنے کو کہا، ان کے احترام اوران کی یاد میں بہت سے مراسم انجام پائے۔

بیروت، دمشق کی مسجدوں اور بیت المقدس میں ان کے لئے غائبانہ نماز میت پڑھی گئی اور بہت سے ممالک جیسے ایران، حجاز، یمن، شام اور لبنان سے بہت سی جماعتوں نے ان کی تدفین، ترحیم اور یاد میں مصر جا کر شرکت کی، ان کی روح خوش اوران کی راہ سالکان راہ سے پر رہے۔

حوالہ

یہ مقالہ ذیل کی سائٹ سے ترجمہ ہوکر تدوین ہوا ہے۔

www.islamonline.net/discussiona/message.jspa?threadid=5814-74k.

عالم اسلام کا تعارف

ٹیونس

ع۔ر۔امیر دہی
ترجمہ: سید شاہد حسین رضوی

ٹونس کا ستقلال اور آزادی

ٹیونس میں آزادی اور استقلال حاصل کرنے کی فکر دیگر تمام افریقی ممالک کی طرح جو سالہا سال یورپ کی استعماری حکومت سے نبرد آزما رہے، برسوں سے موجود تھی، دوسری عالمی جنگ کے بعد ٹیونس کے عوام کی آزادی کی جنگ نے فرانس کو اس سرزمین کے استقلال کو قانونی حیثیت دینے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں فرانس کے وزیر اعظم منڈس فرانس نے حکومت فرانس کی جانب سے قبول شدہ، ٹیونس کی آزادی کے اصول کا اعلان کیا اور ۱۹۵۶ء میں عہد نامہ پر طرفین کی جانب سے دستخط ہوئے اور یہ ملک پوری طرح سیاسی آزادی سے سرفراز ہوا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۵۷ء میں اس ملک میں جمہوری حکومت کا اعلان ہوا اس طرح ٹیونس کی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا اور ۱۹۵۹ء ٹیونس کا بنیادی قانون قومی موسسین کی مجلس نے پاس کیا۔

اس قانون کی پہلی اصل میں لکھا ہے کہ ''ٹیونس ایک آزاد ملک ہے جسے قومی حاکمیت کا حق حاصل ہے۔ اس ملک کا دین، اسلام ہے اور زبان عربی ہے اور حکومتی نظام جمہوری ہے'' اور دوسری اصل میں، جمہوریہ ٹیونس کو مغرب کا ایک جزو شمار کیا گیا ہے جو اتحاد و بھائی چارہ کی راہ میں مشترک منافع و مصالح کے دائرہ میں عمل کرے گی۔ اور چوتھی اصل میں، اس ملک کا نعرہ: جمہوریت، آزادی کی بنیاد پر مستحکم نظام و عدالت، بتایا گیا ہے۔ اور پندرہویں اصل میں: ملک کی تمام سرزمینوں کا دفاع ہر ہم وطن کا وظیفہ بیان کیا گیا ہے۔

جمہوری نظام کا اعلان ہوتے ہی حبیب بورقیبہ جو بائے (Bey) [۱] صدر اور حزب فنو دستور کے قائد

۱۔ ''بائی'' Bey یا ''بیک'' آزادی سے پہلے کے ٹیونس کے صدر کا لقب۔

تھے قومی موسسین کی مجلس کی جانب سے صدر جمہور منتخب ہوئے، وہ اس زمانے میں عوام الناس میں بہت ہی زیادہ محبوب تھے اس لئے کہ رہبر اور آزادی کے باپ ''قائد اعظم'' و ''مجاہد اکبر'' کے عنوان سے پہچانے جاتے تھے۔

اس طرح ٹیونس کو برسوں کی سختیاں جھیلنے کے بعد میراثی شہنشاہیت سے نجات ملی اور ایسا نظام آیا جس کا نام ہر چند جمہوریت ہے لیکن جمہوریت سے پہلے وہ ایک شخصی نظام کی حاکمیت ہے جواب بادشاہ کے بجائے صدر کہا جارہا ہے، اس لئے کہ حاکم پارٹی کے اثر ورسوخ اور قدرت کے سبب بورقیبہ کی صدارت مادام العمر کے لئے تھی اور ۱۹۸۱ء کے انتخابات کے علاوہ بقیہ سارے انتخابات حقیقت میں دکھانے کے لئے ہوتے تھے۔

داخلی حالات اور نئے نئے جھگڑوں نے سیاستمداروں کا جینا دوبھر کر دیا تھا، اس طرح کہ ٹیونس کے عوام کو ۷/نومبر ۱۹۸۷ء کو اچانک ایک خبر ملی جس پر وہ راضی ہوگئے، ٹیونس کے ریڈیو سے اس تاریخ میں ایک پیغام نشر ہوا جس کے مطابق بورقیبہ کو معزول کر کے ان کی جگہ جنرل زین العابدین بن علی جو کل تک وزیر اعظم تھے کو صدر جمہوریہ اور کمانڈر انچیف اعلان کیا گیا۔

''ابن علی'' کے اقتدار پر پہنچتے ہی امریکہ کی وزارت خارجہ نے ایک پیغام بھیجا جس میں حبیب بورقیبہ کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ نئی حکومت کے ساتھ واشنگٹن اور ٹیونس کے روابط کے تحفظ اور مزید رابطہ کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ فرانس کی وزارت خارجہ نے بھی ایک پیغام بھیج کر ''ابن علی'' کی صدارت کی مبارک باد دی اور وسیع پیمانہ پر دوطرفہ تعلقات اور آپسی روابط کو تقویت دینے کی خواہش ظاہر کی گئی۔ (کتاب سبز: ۱۳۶۸ھ ش، ص/۲۸)

اصلاحات سے نئے فتنہ وفساد تک

''ابن علی'' کے اقتدار میں آتے ہی ٹیونس کے عوام اور مقابلہ کرنے والی تمام پارٹیوں نے اس تبدیلی اور ۳۳ سالہ حبیب یورقیبہ کی ڈکٹیٹر شپ کے خاتمہ کا استقبال کیا ٹیونس کی تحریک اتجاہ اسلامی ''دور حاضر کی النہضہ'' کمیٹی نے بھی اس کی تائید کی اور حکومت کے ساتھ اپنی حمایت کا اعلان کیا، ''ابن علی'' نے اعلان کیا کہ شخصی حکومت کو ختم کر کے اقتصادی وسماجی اصلاحات انجام دی جائیں گی اور تمام سیاسی پارٹیوں کو آزادی دی جائے گی۔ انھوں نے حکومت میں موجود سابق صدر کے افراد کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ ٹیونس نے ایک مختصر سا عرصہ ''ابن علی'' کے دور میں ۷/نومبر ۱۹۸۷ء سے صدارتی اور پارلمینٹ کا انتخاب ہونے تک ۱۹۸۹ء بظاہر سیاسی آزادی کا دور گزارا ہے، اس مختصر سی مدت میں سیاسی پارٹیوں نے اپنی فعالیت کی شروعات کی اور مطبوعات کے قانون کی اصلاح کے بعد مختلف اخباروں کو اپنی فعالیت کی اجازت ملی لیکن اس مدت کے ختم ہوتے ہی دوبارہ بورقیبہ کے خفقان کا زمانہ شروع

ہوگیا۔نتیجہ میں تمام پارٹیوں کا رویہ بدل گیا۔

ابن علی کے اقدامات میں سے منجملہ ملک کے بنیادی قانون کی اصلاح تھی، انھوں نے اپنے وعدہ کے مطابق صدر جمہوریہ کے مادام العمر ہونے سے متعلق مادہ کو بدل دیا اور ۵۷ ویں اصل، جس کے تحت خود اقتدار میں آئے تھے، کو لغو کر دیا اور اس طرح وزیر اعظم تک پہنچنے کا راستہ ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیا۔اس کے علاوہ ۱۹۸۸ء میں سیاسی جماعتوں کی فعالیت کی ممانعت کا قانون پاس کیا، اس نے بائیں بازو کی پارٹیوں کو واپس بلا کر ان کے اقتدار کی تجدید کی۔اپریل ۱۹۸۹ء میں پارلیمنٹ کے انتخابات سے پہلے۔(کیہان، شمارہ ۱۴۳۴۲) پارٹیوں کے متعلق ایک قانون پاس ہوا جس کے مطابق صرف انھیں پارٹیوں کو فعالیت کی اجازت تھی جو قومی، مذہبی اور دینی نہ ہوں، اس امر کو عملی جامہ پہنانے سے ''شیخ راشد الغنوشی'' [۱] کی قیادت والی پارٹی ''تحریک اتجاہ اسلامی کا راستہ مسدود ہوگیا، ہر چند اسی وجہ سے اس پارٹی کے رہبروں نے اپنی پارٹی کے نام کو بدل دیا اور ''النہضہ'' نام منتخب کیا جس میں اسلام کی بو پائی جاتی ہے، اسی لئے ابن علی نے انھیں قانونی فعالیت کی اجازت نہ دی، اس طرح تمام پارٹیوں خاص کر اسلامی پارٹیوں کے ساتھ سختی اور ٹکروٗ کے بعد اصطلاحا آزادی کا مختصر دور ختم ہوگیا اور ملک دوبارہ حکومت اور عوام کے مابین رابطہ سے متعلق مختلف تغیرات کا مشاہدہ کرنے لگا۔اس کے بعد ''ابن علی'' نے اپنا حقیقی چہرہ جسے عوام کے نعروں کے پس پردہ چھپائے ہوئے تھا، ظاہر کیا۔دوبارہ مخالفوں پر سیاسی دباؤ کا آغاز ہوا اور سیاسی محاکمہ شروع ہوگیا۔اسلامی جماعتوں کی سیاسی فعالیت کی درخواست رد کر دی گئی۔ان پارٹیوں کے طرفداروں کو قید کر کے اذیتیں دی جانے لگیں اور اسلامی جماعتوں اور اسلامی فعالیتوں کے خلاف تبلیغ شروع ہوگئی۔

''ابن علی'' نے پارلیمنٹ کے اڑاکین کے سامنے کہا: ''ٹیونس میں دینی جماعتوں کی فعالیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، یہ بھی کہا: ''اسلام سبھی کا دین ہے جو اختلاف اور جنگ کا موضوع نہیں بن سکتا اور اس سے متمسک ہو کر اقتدار حاصل نہیں کیا جا سکتا حکومت فقط اسلام کرنے والی ہے'' (امیر شاہی، گزشتہ، ۸۵)

۱۹۹۱ء میں ''النہضہ'' تحریک کے ۸۰۰۰ سے زیادہ ارکان گرفتار ہوئے اور سیکڑوں ارکان شدید اذیتوں کے سبب شہید ہوگئے کچھ دنوں پہلے ۲۷۹ مسلمان مجاہدوں کا ایک فوجی عدالت میں زین العابدین بن علی'' کے قتل کی سازش میں محاکمہ ہوا اور تہمت لگائی گئی کہ یہ ٹیونس کو ایک اسلامی ملک میں تبدیل کرنے کا منصوبہ ہے، ان الزامات کو

۱۔راشد الغنوشی ۱۹۴۱ء میں ٹیونس میں پیدا ہوئے اور جامعہ زیتونہ میں اپنی تعلیم مکمل کی کچھ مدت مصر اور فرانس میں بھی تعلیم حاصل کی اور ٹیونس واپس آنے کے بعد فلسفہ کی تدریس میں مصروف ہوگئے، انھوں نے ۱۹۷۰ء کے شروع میں ماہ نامہ ''المعرفہ'' نشر کر کے ٹیونس کی اسلامی تحریک کا بیج بویا۔

''النہضہ'' تحریک سے وابستہ افراد کو شدید اذیت وشکنجہ دے کر قبولوایا گیا ہے۔(اطلاعات، شمارہ ۱۹۵۵۷)

آخری دو دہوں سے علاقے کے بڑے بڑے مسائل کے سامنے ''ابن علی'' کا موقف اس امر کی حکایت کرتا ہے کہ ٹیونس نے امریکہ کے مقاصد کو پورا کرنے کی طرف قدم بڑھایا ہے اور دوسری بڑی طاقتوں منجملہ فرانس کے منافع کا تحفظ کیا ہے۔

میڈیا کا فکروں کو جلا دینے، مختلف رائے پیش کرنے اور سیاسی جماعتوں اور کمیٹیوں کے موافق ومخالف نظریات کو بیان کرنے میں ایک اہم کردار ہے، آج کے زمانے میں میڈیا ہر اعتبار سے خاص کر اجتماعی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی وعلمی لحاظ سے مختلف اطلاعات کے تبادل کا زمینہ فراہم کر کے واقعات وحوادث سے عام افراد کو زیادہ با خبر کرتا ہے۔ یہ خصوصیات ٹیونس میں قابل دید ہیں، مختلف مطبوعات کا، روزنامہ، ہفتہ نامہ اور ماہنامہ کی صورت میں دو زبانوں، عربی، فرانسوی میں زیادہ شائع ہونا اسی کی نشانی ہے ذیل میں بعض اہم میڈیا کو بیان کیا جا رہا ہے۔

الف)۔عربی اخبار (روزنامہ)

۱۔ الصحافۃ (اس میں داخلی۔علاقائی اور بین الاقوامی مسائل سے متعلق رنگا رنگ مطالب ہوتے ہیں اسے حکومت کی حمایت حاصل ہے)

۲۔ الصباح (جو سیاسی، ثقافتی اور سماجی مسائل پر مشتمل ہے، یہ روزنامہ نیم حکومتی ہے حکومت کے زیر نظر ہے اور اسے حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے۔

۳۔ الحریہ (جو حزب التجمع الدستوری سے متعلق ہے

۴۔ الشروق

ب)۔عربی ہفتہ نامہ

۱۔ الانوار (جو پرائیوٹ ہے)

۲۔ الایام (جو سیاسی، اجتماعی اور ہنری مسائل جیسے میوزک اور ورزش کا حامل ہے)

۳۔ الاخبار (یہ پرائیوٹ ہے اور ڈیئر ٹیونس ہبدو میں شائع ہوتا ہے۔

۴۔ الاعلان (جس میں سیاسی، اجتماعی اور ورزش کی خبریں ہوتی ہیں، اور میڈیکل کی مختلف اطلاعات ہوتی ہیں)

۵۔ صباح الخیر (اس میں پورے ہفتہ کی خبریں ہوتی ہیں اور ڈاکٹری وعلمی مسائل اور واقعات ہوتے ہیں۔

۶۔ الھدیٰ (جو اجتماعی مسائل، ٹیونس اور علاقہ کی خبروں اور واقعات کا حامل ہوتا ہے۔

۷۔ الحدث

ج)۔فرانسسی زبان کے مطبوعات

۱۔ روزنامہ اونرو (حاکم پارٹی کا ترجمان) ''RCD''

۲۔ روزنامہ لا یریس (یہ الصحابہ کا فرانسی زبان میں ترجمہ ہے)

۳۔ روزنامہ لوتام (الصباح کا فرانسی زبان میں ترجمہ

۴۔ ہفتہ نامہ ابدو (سیاسی اور اجتماعی مسائل کا ترجمان

د)۔ ریڈیو

ٹیونس کا ریڈیو عربی، فرانسی اور اٹلوی زبانوں میں اپنے پروگرام پیش کرتا ہے اور ٹیونس کے قفصہ، سفاکس (سفاقس) اور منسٹر نامی شہروں میں ریڈیو اسٹیشن ہیں سٹلائٹ کے علاوہ محدود پرانی مشینیں بھی کام کرتی ہیں۔

ھ)۔ٹیلیویزن

ٹیونس کے ٹیلیویزن نے ۱۹۶۶ء میں ٹیونس کے مرکز اور شمال میں پہلی بار اپنے کام کی شروعات کی ۱۹۷۲ء تک پورے ملک میں چھا گیا چند سال پہلے تک صرف ایک ہی چینل عربی اور فرانسی زبان میں کام کر رہا تھا اور اس وقت دو چینل عربی میں ہیں۔جن کا نام (قناۃ سبعۃ) اور (قناۃ الشباب) ہے ۱۹۸۳ء میں ایک اور چینل فرانسی زبان میں شروع ہوا ہے اور کچھ ہی دنوں پہلے سے چینل نمبر ا اور پرائیوٹ چینل (افق) فرانسی زبان میں چل رہا ہے (امیر شاہی، گزشتہ، ص ۳۵و۳۳)

سٹلائٹ کا اضافہ ہونے کے سبب عوام مقامی چینلوں کے علاوہ دوسرے بیرونی چینلوں سے استفادہ کرتے ہیں، اسی طرح کمپیوٹر اور انٹرنٹ سے بھی کافی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

و)۔ صحافت

ٹیونس کی مقامی صحافت (جو ۱۹۶۱ء میں تاسیس ہوئی ہے اور اس کا مرکز دارالحکومت ہے) کے علاوہ اکثر بین الاقوامی صحافتیں ٹیونس کے مغربی افریقہ کے مرکز ہونے کے سبب اس ملک میں اپنے نمائندہ رکھتی ہیں۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ ثقافتی تعلقات

اسلامی ممالک اور قوموں کے درمیان موجودہ مشترکات آپسی تعلقات میں اضافہ کا بہترین زینہ ہیں ہر چند کبھی کبھی سیاسی، قومی اور نسبی رکاوٹیں دینی وثقافتی تعلقات میں کمی کا سبب ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں ملکوں میں جدائی ہوتی ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے ہی ٹیونس اور ایران میں اچھے تعلقات رہے ہیں اور ایران کے بہت سے فقہا و دانشوروں نے فاطمیون کی خلافت کے دور میں ٹیونس ہجرت کی تھی البتہ عثمانی حکومت کے دور میں ایران اور عثمانی سلطنت میں اختلافات کے سبب یہ تعلقات بہت کم ہو گئے تھے۔ زمانہ قدیم سے ایرانی ثقافت کا ٹیونس میں اثر تھا، ایران کا پورا اثر اغلبیوں کے دور سے شروع ہوا جب ہارون الرشید نے افریقہ کی حکومت ابراہیم بن اغلب کے حوالے کی وہ زیادہ تر خراسانی لشکر کے ساتھ افریقہ میں سکونت پذیر ہوا اور ایرانی ثقافت اور آداب وتہذیب اس علاقے میں رائج کی۔

اس دور کے بعض ایرانی مفکرین یہ ہیں: عبداللہ بن فروج فارسی (متوفی ۱۷۶ھ) خالد بن یزید فارسی اور اسد بن فرات نیشاپوری (متوفا ۲۱۴ھ) جو بہت ہی بڑے مالکی فقیہ تھے۔

ٹیونس کی ثقافت پر ایرانیوں کے اثر کا دوسرا مرحلہ چھٹی صدی کے آغاز میں جب افریقہ میں صنہاجی امراء کے زوال کا زمانہ تھا اس زمانہ میں مستقل امراء، حکومت کرتے تھے، منجملہ بنوخراسان جو ایرانی الاصل تھے اور انھوں نے ٹیونس شہر کو اپنا سیاسی اور حکومتی مرکز بنا رکھا تھا۔ ٹیونس کے تحت الحمایہ ہونے سے پہلے ساتویں صدی سے تیرہویں صدی تک ٹیونس کے دو مدرسہ زیتونیہ اور صادقیہ میں فارسی زبان پڑھائی جاتی تھی، آج بھی ٹیونس شہر کی بہت سی شاہراہیں ایران کے بڑے بڑے شعراء اور فلسفیوں کے نام سے مزین ہیں جیسے خیام، حافظ، مولوی، ابن سینا، فارابی اور رازی (الشاہی ودیگران: ۱۹۷۱ص/۸و۹و۱۱، دانشنامہ جہان اسلام، گزشتہ، ص/۶۳۹)

ٹیونس کی آزادی کے بعد فارسی زبان اور ادبیات کے لئے ایک معلم کی جگہ رکھی گئی جہاں پڑھانے کے لئے معلم تہران سے بھیجے جاتے تھے، جس کے نتیجہ میں دونوں ملک کی تعلیم وثقافت کے مسؤلین ایک دوسرے ملک کو دیکھنے آئے اور ٹیونس میں ایران کے کلچر اور ہنر کی نمایش قائم کرنے کا اقدام کیا ۱۳۵۰ھ ش میں ایران کے کلچر اور ہنر کے وزیر کے ٹیونس کے دورہ کے ساتھ ہی دونوں ملکوں کے وزرا کے درمیان کلچر اور ہنر سے متعلق معاہدہ کا تبادلہ ہوا اور دونوں ملکوں کے طالب علموں کے ردوبدل کا معاہدہ بھی ہوا یہ معاہدہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد معلق ہو گیا اور اب تک پیہم گفتگو کے باوجود نئے طور پر کوئی موافقت انجام نہ ہو پائی ہے۔

۱۹۷۲ء میں ٹیونس کی حکومت نے تہران میں سفارتخانہ کا افتتاح کیا لیکن ۱۹۸۲ء میں ایران عراق جنگ کے بہانہ ٹیونس تہران میں اپنی نمائندگی کو معطل کر دیا۔ ٹیونس کی حکومت نے تحمیل شدہ جنگ میں عراق کی کھل کر حمایت کی اور بین الاقوامی محفلوں میں ایران کے خلاف رائے دی خصوصا حقوق بشر سے متعلق مسائل میں ۔

۱۳۶۶ھ ش میں ایران کے سفیر کو ٹیونس سے خارج کیا گیا اور پوری طرح دونوں ممالک کے تعلقات ختم ہو گئے، ۱۳۶۹ھ ش میں دوبارہ سیاسی تعلقات برقرار ہوئے اور ۱۳۷۲ھ ش میں سفیر کی سطح تک پیش قدمی ہوئی اور تجارتی واقتصادی پیمانہ پر کافی حد تک تعلقات آگے بڑھے (دانشنامہ جہان اسلام، پیشین، ص ۶۴۸ و ۶۴۹)

اگر چہ اسلامی جمہوریہ ایران کی سفارت نے ٹیونس سے سیاسی واقتصادی اور ثقافتی پیمانہ پر مزید تعلقات کی راہ میں بڑے قدم اٹھائے ہیں لیکن ٹیونس کی حکومت میں امریکہ کا نفوذ اور ایران کے خلاف زہریلی تبلیغ نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رکھا ہے تا کہ دونوں ملکوں میں وسیع و ہمہ گیر سطح پر ثقافتی تعلقات برقرار نہ ہونے پائے، اس ملک میں موجودہ سیاسی خفقان اسلامی جمہوریہ ایران کی حقیقتوں سے باخبر ہونے میں حائل ہے اور یہی مسئلہ اکثر عربی ممالک میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

سیاسی واجتماعی انجمنیں اور کمیٹیاں

آزاد اور نصف آزاد ممالک میں مخصوص سیاسی واجتماعی کمیٹیاں اور پارٹیاں وسیع پیمانہ پر بنتی رہتی ہیں، ان پارٹی بازیوں کے ذریعہ سماجی فکر کی ہدایت کرنا سماجی امور کے ٹھیکہ داروں کی فعالیت کی ایک قسم ہے، ٹیونس میں مختلف صورت سے منجملہ، جغرافیائی لحاظ سے یورپ سے نزدیکی، اکثر لوگوں کا فرانسسی زبان سے آشنا ہونا، تعلیمی سسٹم کی وسعت، اعلیٰ درجہ پر تعلیم کے متعدد مراکز کا وجود، بیرونی خاص کر یورپی سیاحوں کی بڑی تعداد میں رفت و آمد، مطبوعات کی فعالیتی وسعت اور بیرونی مطبوعات تک لوگوں کی رسائی اور ٹیونس کے عوام کی معلومات کا تیسری دنیا کے ممالک سے زیادہ ہونا، انجمن، سنڈیکیٹ اور، تحریک جیسے مفاہیم اور مطبوعات کی آزادی جانی پہچانی ہے، یہ معلومات اور نسبتا ممالک میں آزادی باعث بنی کہ مختلف گروہ اور پارٹیاں وجود میں آئیں ان میں سے اہم حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بنیادی قانون میں ڈمکریسی کے طرفداروں کی پارٹی (R C D) جو ۱۹۸۸ء صدر جمہوریہ زین العابدین بن علی کے ذریعہ تشکیل پائی یہ پارٹی سوسیالیسٹی دستور (P S D) کی جگہ پر بنی۔ جس کی بنیاد حبیب بورقیہ کے ذریعہ ۱۹۳۴ء میں رکھی گئی تھی اور جو ایک اعتدال پسند اور جمہوریت پسند بائیں بازو کی پارٹی تھی، موجودہ

پارٹی کی صدارت ''ابن علی'' کے ذمہ ہے جس کے سکریٹری شاذلی نفاتی ہیں۔

۲۔ اتحاد خلق کی تحریک (M . U . P.) جو اصلاحات کی شدید طرفدار پارٹی تھی جو اس وقت احمد بن صلاح اور بالحاج آموز کی قیامت میں دو پارٹیوں میں تقسیم ہو چکی ہے اس نے ۱۹۸۱ء کے انتخاب میں شرکت کی اور ۱۹۸۳ء میں اسے قانونی حیثیت ملی ہے اور اس نے اپنا نام اتحاد خلق کی تحریک (M . U . P.) رکھا ہے۔

۳۔ سوشلسٹ ڈیموکریٹ تحریک (M.S.D.) اس تحریک نے ۱۹۸۱ء کے انتخابات میں شرکت کی اور ۱۹۸۳ء میں اسے قانونی حیثیت ملی یہ تحریک سیاسی تجمع کے سسٹم کی طرفدار ہے اس کے سکریٹری احمد مستیری ہیں۔

۴۔ ٹیونس کمیونسٹ پارٹی (PCT) جس کی تاسیس ۱۹۳۹ء میں ہوئی ۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۱ء تک اسے فعالیت سے منع کر دیا گیا تھا اس کے سکریٹری محمد ہرمل ہیں اور ۱۹۹۳ء میں اس نے اپنا نام بدل کر التجدید رکھا۔

۵۔ ٹیونس کے سوشلسٹوں کی جماعت جس کی تاسیس ۱۹۸۳ء میں ہوئی اس کے سکریٹری نجیب ہیں جو بائیں بازو کے ہیں۔

۶۔ اسلامی تحریک النہضہ جس کے قائد راشد الغنوشی ہیں اس تحریک کو ۱۹۸۱ء سے فعالیت سے منع کر دیا گیا ہے اور فی الحال ایک غیر قانونی تحریک شمار ہوتی ہے۔

اسی طرح دیگر اہم کمیٹیاں جن کی تعداد ۱۵ کے قریب ہے ٹیونس میں اپنی فعالیت انجام دے رہیں ہیں جن میں سے نہایت اہم حسب ذیل ہیں:

۱۔ ٹیونس کے عام کاریگروں کی کمیٹی (U . G . T . T.) جس کی بنیاد ۱۹۴۶ء میں فرحت حاشہ کے ذریعہ رکھی گئی جس میں ۱۷۵،۰۰۰ سے زائد ممبر ہیں جو ۲۳ کمیٹیوں کو ملا کر بنی ہے۔

۲۔ ٹیونس کی خواتین کی قومی کمیٹی (U . N . F . T.) جس کی ۱۹۵۶ء میں تاسیس ہوئی اس میں ۴۵،۰۰۰ سے زائد ممبر ہیں اس کی سکریٹری فاطمہ دویق (F . Douik) ہیں۔

۳۔ ٹیونس کی طلبہ کی عمومی کمیٹی (U . G . F . T.) جس کی تاسیس ۱۹۵۳ء میں ہوئی، اس میں ۶۰۰ ممبر ہیں جس کی قیامت فی الحال مکی فتوری کے ہاتھوں میں ہے (امیر شاہی، گزشتہ، ص ۷۳۔۷۵)

گزشتہ دو دہائیوں میں ٹیونس کی داخلی صورت حال

ٹیونس کی موجودہ حکومت عالمی استکبار کی حمایت کے ذریعہ اسلامی تحریک کے طرفداروں کے ساتھ سخت رویہ اپنائے ہوئے ہے لیکن یورپ اور عربی میڈیا بھی ان جنایتوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہے یہ لوگ ٹیونس میں اسلام

کی دوبارہ حیات سے تشویش میں ہیں۔

ابن علی کے مشیر، صلاح الدین معاویہ نے ''بش'' سے مخاطب ہوکر کہا تھا ''اسلام پسند فکر میں وسعت فقط عربی ممالک کے ثبات کو ہی متزل نہیں کر رہی ہے بلکہ صنعتی ممالک کے لئے بھی خطرہ بن رہی ہے'' گلی زوارہ: ۱۳۸۰ ھ ش، ص/۳۵۸)

یہ حکومت جو اسلامی فکر کے منطقی طرز عمل کے سامنے عاجز ہوگئی ہے، اسلامی تحریکوں کو اس طرح سے نمایاں کر رہی ہے تاکہ مغرب سے سیاسی اور مادی مدد کی صورت میں باج حاصل کرے۔ ابن علی نے جو ابتدا میں اعلان کر رہا تھا کہ ''وہ اسلامی اصالت کو حیثیت دینا چاہتا ہے''! اس نے مسجدوں کے قانون کی بنیاد پر جو ۱۹۸۸ء میں پاس ہوا تھا ہر طرح کی مذہبی فعالیت یہاں تک کہ قرآن پڑھنا بھی ممنوع قرار دے دیا مگر یہ کہ وزارت عظمیٰ کے دفتر سے اجازت لی جائے۔! یہ ایسا کام تھا کہ جسے فرانس نے بھی ٹیونس پر قبضہ کے دوران انجام نہیں دیا۔

جامعہ زیتونہ جو مصر کی الازہر دانشگاہ سے پہلے تاسیس ہوئی خود سر بورقیبہ کی حکومت کے فرمان سے ۳۰ سال تک معطل رہی اور ابن علی کی حکومت کے دور میں اسے مختصر طور پر فعالیت کی اجازت ملی، ۲۹ جولائی ۱۹۹۰ء میں اسلامی فعالیتوں کے سبب دوبارہ معطل ہوئی اور اس کی فعالیت کو روکنے کے لئے اس اسلامی دانشگاہ پر چھاپہ پڑا اس کی سندیں ضبط کر لی گئیں۔ اس کے بینک کا حساب بند کر دیا گیا۔ (ہفتہ نامہ، بعثت، ۱۳۸۰/۸/۱۳) اور اس سے مقابلہ کے لئے فرانسسی زبان کے ۸۰۰ استاد فراہم کئے گئے کہ اسلامی ثقافت اور عربی زبان کا مقابلہ کریں۔

اسلامی حکام کو چاہئے کہ مسلمانوں کے مصالح اور منافع کے تحفظ کی کوشش کریں اور دینی و انسانی حیثیت کے زندہ کرنے میں کوشاں رہیں۔ اور اپنی چندروزہ زندگی کی خاطر امت مسلمہ کے انجام کو اجنبیوں کے ہاتھوں میں دیں، دشمنوں خاص کر بڑی طاقتوں کے زہریلے اور گمراہ کن پروپیگنڈوں کے مقابل مسلمانوں میں ہوشیاری، اتحاد اور بھائی چارگی ہی اسلام کو اس سرزمین پر دوبارہ سے زندہ کرنے کی زمین ہموار کر سکتی ہے اور وہ ٹیونس جو صدیوں تک اسلامی تشکلات کا مرکز اور مسلمانوں کے یورپ میں داخل ہونے کا مرکز تھا، شعائر اسلامی کی حمایت کے ذریعہ دوبارہ سے پوری طرح جلوہ نما ہوکر مسلمانوں کی عزت اور سربلندی میں اضافہ کر سکتا ہے۔

منابع و مآخذ

۱۔ الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ، موسسۃ اعمال الموسوعۃ للنشر والتوزیع، ریاض، طبع دوم، ج/۷، ۱۴۱۹ھ

۲۔ الموسوعۃ العربیۃ المیسرہ، الجمعیۃ المصریۃ لنشر المعرفۃ والثقافۃ العالمیۃ، دار الجیل، طبع دو، ج/۲، ۲۰۰۱ء

۳۔میر شاہی ذوالفقار، ٹیونس، دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی وزارت امور خارجہ، موسسہ چاپ وانتشارات تہران، طبع دوم ۱۳۷۴ھ ش
۴۔ٹیونس جریانہای سیاسی، روزنامہ کیہان، شمارہ ۱۴۳۴۲
۵۔حموی، یاقوت، معجم البلدان، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ج ۱۳۹۹۲/ھ
۶۔خبرگزاری مہر، کریسمس، ۲۰۰۷ء
۷۔خریطۃ الطرقات، الدیون القومی للسیاحۃ التونسیۃ، ٹیونس ۲۰۰۱ء
۸۔دانشنامہ جہان اسلام، زیرنظر غلام علی حداد عادل، بنیاد دائرہ المعارف اسلامی، تہران، طبع اول، ج ۱۳۸۳۸/ھ ش
۹۔علی الشای ودیگران، ٹیونس وایران قرون من التلاقح الحضاری، الدار التونسیۃ للنشر، ٹیونس ۱۹۷۱ء
۱۰۔گزارش سازمان عفو بین الملل، روزنامہ اطلاعات، شمارہ ۱۹۵۵۷۔
۱۱۔گلی زوارہ، غلام رضا، شناخت کشورہای اسلامی ونواحی مسلمان نشین جہان، مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی قم طبع سوم، ۱۳۸۰ھ ش
۱۲۔ہفتہ نامہ بعثت، سال دوازدہم، شمارہ ۳۵، ۱۳/۸/۱۳۷۰ھ ش
۱۳۔ Voice of America , 02 / 04 / 2004